محرم الحرام۔ ربیع الاوّل ۱۴۳۹ھ
اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ء

ماہی حکمت قرآن لاہور

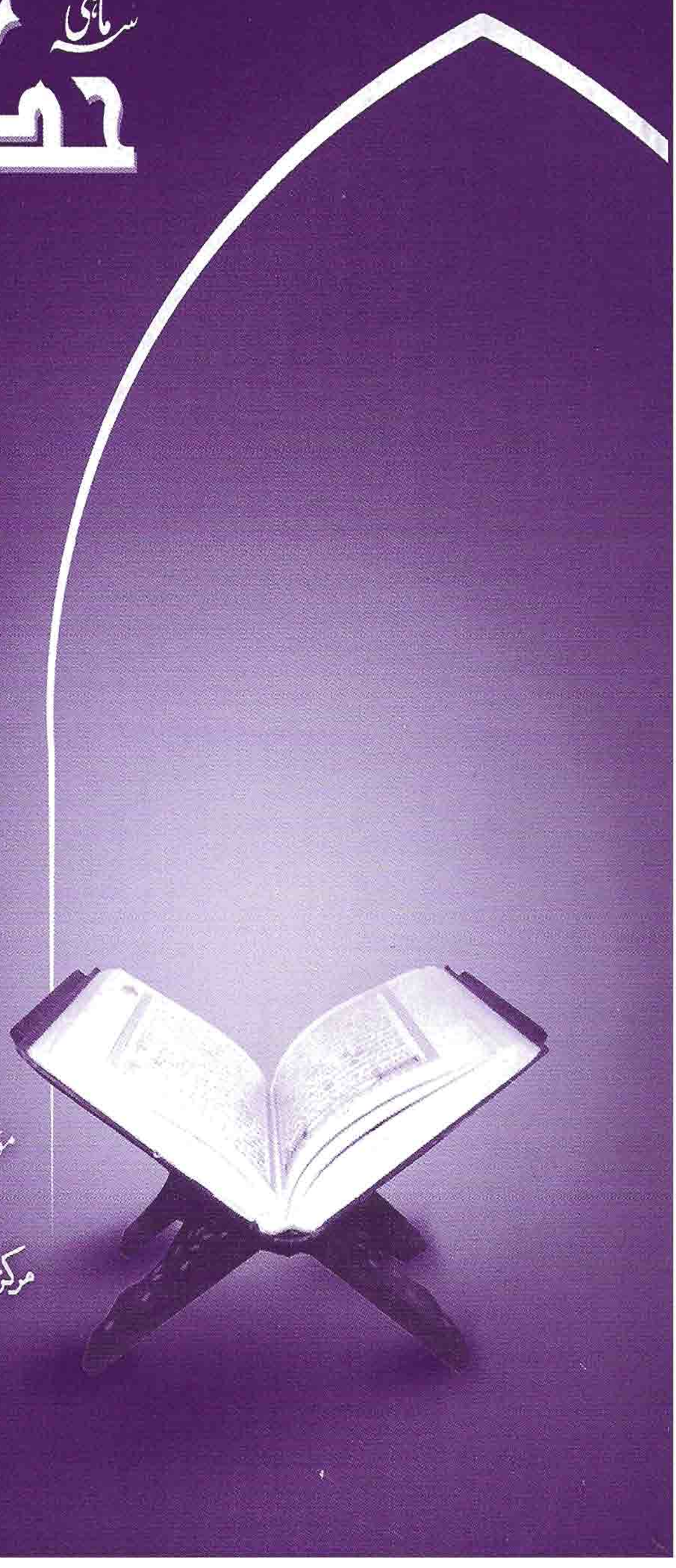

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

عوامی ایڈیشن

اب نئے اور منفرد گیٹ اَپ اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ

- کتابی سائز میں
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر

ان شاء اللہ العزیز، تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر
ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔

یہ سیٹ ''کم قیمت بالانشیں'' کا منہ بولتا ثبوت ہوگا!

6 حصوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت صرف -/1800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

دینِ حق اور جدیدیت گزیدہ ذہن ورویّہ	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاكُ التأويل (۱۱)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	6

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	17

فہمِ دین

معرفتِ حدیث کے بنیادی علوم	ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی	33

فکر و نظر

دینی بیانیہ اور تفہیمِ مغرب کی ضرورت	محمد رشید ارشد	45

حُسنِ معاشرت

اسلام میں عورت کا مقام اور میاں بیوی کے باہمی معاملات (۳)	پروفیسر حافظ قاسم رضوان	59

یاد رفتگاں

مہکتے برگد	ڈاکٹر عمران وحید	74

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	82

بیانُ القرآن

96	Dr. Israr Ahmad	MESSAGE OF THE QURAN

دینِ حق اور جدیدیت گزیدہ ذہن ورویّہ

ڈاکٹر ابصار احمد

جمہور علمائے ربانی اور متکلّمینِ سلف کے نزدیک جہاں ایک طرف اسلام اور اس کے اوامر ونواہی اپنی ساخت اور بناوٹ میں اور اسلامی نظامِ حیات (یعنی شریعت) فی نفسہٖ معقول المعنیٰ تصور کیا گیا ہے' اس کے مسائل واحکام میں تعلیل ومصالح کے مضمرات نفوسِ مزکّی کو ہمیشہ نظر آئے ہیں' وہاں دوسری طرف اسی عقل وفہم کو حقیقی اور مصدقہ (authentic) سمجھا گیا جو قرآن وسنت سے مستفاد ومحصور ہے۔ جس کی بنیاد خداشعوری' احساسِ بندگی' تقویٰ اور آخرت طلبی ہے اور جو اپنی محدودیت سے آگاہ ہے۔ دراصل قرآن کی الٰہیاتی علمیات کے مطابق منزّل من اللہ حقائق کا فہم ہی اصل تعقّل' تفکّر' تذکّر اور علم وفہم کے در وا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے جابجا اس امر کی صراحت کی ہے کہ وحی الٰہی کی غرضِ تنزیل ہی یہ ہے کہ لوگ عقل وفکر سے کام لیں۔ یعنی قرآن وسنت کے بیان کردہ حقائق ومعارف کا گہرا شعور اور فہم ہی حقیقی تعقّل وتفکّر اور تدبّر ہے جو مبدأ ومعاد کی گتھیاں حل کرتا ہے۔

اسلامی عقائد وتعلیمات کی داخلی نورانیت اور حکمت ہی کے باعث اسلام کے دفاع کے لیے متکلّمین گروہ درگروہ سامنے آئے اور اس کے معارف وحِکَم پر تصانیف قلمبند کیں۔ غزالی' عزّالدین بن عبدالسلام اشعری' خطابا' ابن تیمیہ' حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم جیسے جلیل القدر علمائے اسلام نے عقائد کے مباحث سلجھائے اور عبادات کے اسرار ورموز واضح کیے۔ علوم القرآن' علوم الحدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ الٰہیات اور فکر وفلسفہ میں متذکرہ بالا اور ان کے پائے کے بیسیوں دوسرے مشاہیر اسلام نے ہمارے دین اور تہذیب کی اَسلافی ومتواتر روایت کی بنیادیں بالوضاحت قائم کی ہیں۔ جن میں ایک طرف علمیات' اخلاقیات' معاشرت ومعیشت اور جملہ مابعد الطبیعیاتی مباحث پر قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی تعلیمات انتہائی حکیمانہ اور بصیرت افروز انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف الحاد وزندقہ اور گمراہ فرقوں کے خیالات پر چشم کشا نقد وتبصرہ ہے۔ الغرض اسلامی علمیت کی تشکیل' ایمان' تقویٰ' تدیّن اور روایت کے حوالوں سے ہوتی ہے جو قطعی وحتمی ایقان فراہم کر کے نہ صرف ذہنی وقلبی آسودگی عطا کرتی ہے بلکہ اُخروی نجات اور فوز وفلاح کی ضامن بھی ہے۔

مندرجہ بالا سطور راقم نے اپنی تحریر بعنوان ''اسلامی علمیت بمقابلہ سائنسی جدیدیت'' سے لی ہیں جو 'حکمت قرآن' کے سال ۲۰۱۵ء کی تیسری سہ ماہی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اسلامی منہاج میں وحی (Revelation) کو جو مرکزی اور جوہری حیثیت حاصل ہے' اس کی روشنی میں اسلام کے معتقدات اور تصورِ دین آخری درجے

کے ٹھیٹھ پن کا تقاضا کرتے ہیں اور اس میں وہ ذرہ بھر مفاہمت قبول نہیں کرتے۔ صدیوں پر محیط مین سٹریم اسلام' قرآن کریم کی ابدیت وتحکمیت اور حتمیت کے اقرار' رسول اللہ ﷺ کی سنت وتشریحات اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تعبیرات پر مصر ہے اور اس سے انحراف کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ دین کا منہاجِ علم اور طریقِ تفہیم اپنے ماننے والوں سے مکمل اثبات اور غیر مشروط انقیاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ شریعت کی حاکمانہ حیثیت اور اسلام کو سوسائٹی اور ملک وسیاست پر حاوی کروانے کی جِدّوجُہد اہلِ سنت جماعۃ المسلمین کے اعتقاد کا جزو اصیل ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام صرف روحانی اور اخلاقی ضابطوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق امور ریاست سے بھی ہے۔

دوسری جانب اسلام کی حقانیت اور دینی فکر کو جدید ذہن کے لیے قابل فہم بنانے کے لیے عالم اسلام میں موجود بہت سے ادارے اور افراد اپنے اپنے انداز میں کوشش کر رہے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ کثیر تعداد میں یہ مساعی افراط وتفریط کا شکار ہو کر قرآن وسنت پر مبنی اسلامی تعلیمات کی متواتر وروایتی تفہیم پیش اور پروموٹ نہیں کر سکیں' بلکہ ان کی تعبیرات وتفہیمات میں سیکولر اور لبرل افکار کے اثرات بڑے واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مغربی دنیا اور بالخصوص امریکہ کے بعض ادارے مثلاً Templeton Foundation اور اسی قبیل کے دوسرے ادارے خطیر رقم خرچ کر کے اپنے چنیدہ مسلمان پروفیسروں کو پاکستان' بھارت اور دوسرے ممالک میں بھیج کر ان ممالک کے روایتی مدارس اور دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ علمی تبادلہ خیال (''مکالمہ'') اور تعامل کے ذریعے انہیں مذہبی اور کلچرل تکثیریت (pluralism) اور جدیدیت کے لیے ذہناً تیار کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ دو اڑھائی ماہ قبل امریکی یونیورسٹی کے چند پروفیسر پاکستان (گوجرانوالہ اور اسلام آباد) اور بھارت میں بعض جگہوں پر ''مدرسہ ڈسکورس'' کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کرنے میں مصروف رہے۔ ان کی تصاویر اور مختصر فکری بیانیہ انٹرنیٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے اس پورے پراجیکٹ کو ان فاضل حضرات نے ''Contending Modernities'' کا عنوان دیا ہے' یعنی جدیدیت کی بھی صرف کوئی ایک قسم نہیں ہے' بلکہ اس کی متعدد اشکال اور تشکیلات ہیں جو قدیم روایتی مسالک سے برسرپیکار ہیں' اور مین سٹریم اسلام میں آگے بڑھنے اور مسابقت کے لیے کوشاں ہیں۔ میری دانست میں مغرب میں حصولِ تعلیم کے بعد ان حضرات نے لاشعوری طور پر مذہب کے معمولی سے لاحقے (Tag) کے ساتھ اپنی فہم وفکر میں جدیدیت کے ہیومنسٹ ڈیموکریٹک پیراڈائم (Humanist Democratic Paradigm) کو قبول کر لیا ہے۔

''Contending Modernities'' پروگرام ایک اطلاع کے مطابق دو اڑھائی سال جاری رہے گا اور اس کو چلانے والے علمی حضرات میں دو نام نمایاں ہیں: جناب پروفیسر ابراہیم موسیٰ اور ڈاکٹر ماہان مرزا۔ اول الذکر کا آبائی تعلق انڈیا سے لیکن اب ساؤتھ افریقہ سے ہیں اور مؤخر الذکر کا تعلق پاکستان سے ہے جہاں وہ پلے بڑھے اور انجینئرنگ میں ڈگری امریکہ سے کی۔ عجیب بات ان دونوں حضرات کے حوالے سے یہ

ہے کہ انہیں ٹھیٹھ روایتی اسلام (Traditional Islam) کو نہ صرف دیکھنے بلکہ ایک درجے میں مطالعے کا موقع بھی ملا ہے۔ ابراہیم موسیٰ نے کچھ عرصہ دیوبند مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور بعدازاں امریکہ میں اسلامی علوم کی تحصیل کی۔ جبکہ ماہان مرزا امریکہ میں صدر مؤسس انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے دروس قرآنی اور لیکچرز سے متاثر ہو کر نہ صرف دین کی طرف آئے بلکہ وہاں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر کے پاکستان آ کر قرآن اکیڈمی میں تحریک رجوع الی القرآن میں شامل ہو کر قرآن وحدیث اور عربی کی استعداد بڑھانے میں وقت صرف کیا۔ وہ کچھ عرصہ تنظیم اسلامی کے اسلام آباد کے حلقے میں عملاً شامل رہے اور ایک بار تنظیم کے سالانہ اجتماع کے موقع پر بھی ان کا خطاب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انٹرنیٹ پر اپنے CV میں قرآن اکیڈمی لاہور کا ذکر کیا ہے۔ لیکن پھر امریکی اکیڈمک اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر انہوں نے مغربی اقدارِ حیات' ثقافتی رجحانات اور علمی آراء سے ایسی سازگاری ظاہر کی ہے کہ جیسے یہ بھی کوئی منزّل من اللہ مذہب ہے۔ ان حضرات کے ہاں یہ ذہنی تحولِ عظیم کیوں اور کیسے آیا؟ — ان سوالات کو عزیزم استاذ رشید ارشد نے اپنے مضمون ''دینی بیانیہ اور تفہیمِ مغرب کی ضرورت'' میں گہرے اور فلسفیانہ تحلیل وتجزیے کے ساتھ بیان کیا ہے جو اس شمارے میں شامل ہے۔ سردست علمی مباحث سے اغماض برتتے ہوئے راقم اتنا عرض کرنا چاہے گا کہ ''یُسر'' پر قائم مذہبی کلچر اور 'امریکی اسلام' شاید کسی درجے میں مغرب کے باسی مسلمانوں کو قابلِ قبول ہو' لیکن یہ بلادِ اسلامیہ کے قرآن وسنت کو ماننے اور ان پر عمل کر کے آخرت میں اجر اور کامیابی کے طالب مسلمانوں کے ہاں بار نہیں پا سکتا۔

اس مختصر بحث کے تناظر میں فواد سیزگن کی مشہور کتاب **محاضرات فی تاریخ العلوم العربیة والاسلامیة** کا یہ پیراگراف میرے نقطہ نظر کی بہت خوبصورتی اور مؤثر انداز میں وضاحت کرتا ہے:

> ''دورِ جدید کے لیے حقیقت کا مفہوم بنیادی طور پر ''ارتقائی'' ہے' جو مسلسل معلوم سے بلند تر کی طرف سفر کرتا رہتا ہے' جبکہ اس کا مفہوم اسلامی آرتھوڈوکسی [مراد عقیدۂ اہلِ سنت] میں ایک حتمی اور مستقل شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب میں مسلسل ایک ذہنی غلغلہ برپا رہتا ہے' جبکہ مشرق پر وُہی جانی پہچانی آسودگی چھائی رہتی ہے جو اس کا امتیاز ہے اور جس کا اشتیاق گاہے گاہے گوئٹے نے ظاہر کیا۔ مشرقی اسلامی ذہنیت میں ''تبدیل نہ ہونے'' کی کیفیت جدید مغربی تہذیب کو جمود نظر آتی ہے' جبکہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں نئی نئی باتوں کو ''بدعت'' تصور کیا جاتا ہے جن کی حقیقت مشکوک اور مشتبہ ہے۔ مسلمانوں کے ہاں ہر وہ عہد روبہ زوال ہے جو قدیم مثالی معیار سے ہٹ گیا ہو' جبکہ سیکولر فرزندانِ مغرب کسی عہد کو اس لیے روبہ زوال تصور کرتے ہیں کہ اس میں کوئی تغیر ہی پیدا نہیں ہوا۔''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دین متین اور اس کے تقاضوں کو اسی طرح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں جیسا کہ وہ ہیں' آمین!

مِلاکُ التأوِیل (۱۱)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ النِّساء

(۶۵) آیت ۲۲ :

﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾﴾

''اوران عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا تھا اِلّا ایسے (نکاح) جو پہلے ہو چکے ہیں۔ بے شک یہ بدکاری ہے' بغض کا سبب ہے' اور برا راستہ ہے۔''

اور سورۃ الاسراء کی آیت ۳۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾﴾

''اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ' بے شک یہ بدکاری ہے اور بُرا راستہ ہے۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ النساء میں ''مَقْتًا'' کا اضافہ ہے جو کہ سورۃ الاسراء کی آیت میں نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ''مقت'' نقص اور حقیر جاننے کو کہتے ہیں۔ جو شخص اپنے باپ کی منکوحہ سے شادی کرتا ہے وہ انتہائی رذیل کام کا مرتکب ہوتا ہے کہ جس کی بنا پر ایسے شخص کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' اسے برا سمجھا جاتا ہے' طبع سلیم ایسے کام سے اباء کرتی ہے اور اس لحاظ سے گو یہ زنا کاری ہے لیکن اس سے بڑھ کر قبیح کام ہے۔ اس لیے سورۃ النساء کی آیت میں ''مقت'' کا اضافہ کیا گیا۔

(۶۶) آیت ۲۵ :

﴿مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ﴾

''(ایسی لونڈیوں سے) جو پاکباز ہوں' زنا کاری نہ کرتی ہوں اور نہ ہی دوست بنا کے رکھتی ہوں۔''

اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ﴾

''(اور یہ مرد) پاک باز ہوں' زنا کاری نہ کرتے ہوں اور نہ ہی داشتائیں بنا کر رکھتے ہوں۔''

یہاں کوئی خاص اشکال نہیں ہے' کیونکہ پہلی آیت کا تعلق ایسی لونڈیوں سے ہے جن سے اس وقت شادی کی جاسکتی ہے جب کہ ایک مرد آزاد مسلمان عورت سے شادی کرنے پر قادر نہ ہو اور دوسری آیت میں مردوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اہلِ ایمان یا اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں لیکن انہیں خود بھی پاکبازی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

(۶۷) **آیت** ۴۱:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾

''اور پھر (دیکھنا) کیسے جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو اٹھائیں گے تو تمہیں ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے۔''

اور سورۃ النحل کی آیت ۸۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾

''اور ہم تمہیں گواہ بنا کر لائیں گے ان لوگوں پر۔''

سوال یہ ہے کہ دونوں آیات کا مضمون ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ رسولوں کو ان کی اُمتوں پر گواہ بنا کر اور ہمارے نبی ﷺ کو ان کی امت پر گواہ بنا کر لایا جائے گا تو پھر لفظ ''شَهِيْد'' کی تقدیم (دوسری آیت میں) اور تاخیر (پہلی آیت میں) کیوں ہے؟

اور اس کا جواب — واللہ اعلم — یہ ہے کہ سورۃ النحل کی آیت میں ماقبل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾

''اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ انہی میں سے اٹھائیں گے ان پر گواہی دینے کے لیے۔''

تو یہاں گواہ کا ذکر مشہود علیہ (یعنی امت) سے پہلے لایا گیا تھا اور اسی تناظر میں پھر کہا گیا:

﴿وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾

اور اس لحاظ سے شہید (گواہ ہونے) کا ذکر پہلے لایا گیا اور مشہود علیہ (هٰٓؤُلَآءِ) کا بعد میں' تاکہ آیت کے پہلے حصے کے ساتھ مناسبت باقی رہے۔

اور سورۃ النساء کی آیت میں مشہود علیہم کا ذکر نہ صراحتاً آیا تھا اور نہ ہی اسم ضمیر یا اسم اشارہ سے اس کی طرف توجہ دلائی گئی تھی' بلکہ ''عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ'' سے جو لوگ مراد ہو سکتے ہیں ان کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ (آیت ۳۸)

''اور جو لوگ دوسروں کو دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہیں۔''

یہاں منافقین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور اس لحاظ سے یہ مناسب تھا کہ لفظ ''شَهِيْد'' سے پہلے ''عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ'' کہہ کر ان کی طرف اشارہ کر دیا جاتا۔ اور پھر مفہوم یہ بنتا ہے کہ گویا ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور مراد نہیں

ہے اور یہ کہ آپ ﷺ ان کے علاوہ کسی پر گواہ نہ ہوں گے۔ یہ اسلوب وہی ہے جو شاعر نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے: ع

لَتَقْرَبُنَّ قَرَبًا جَلْدِيًّا مَا دَامَ فِيهِنَّ فَصِيلٌ حَيًّا

(اس شعر کی وضاحت نمبر ۳۲ (قسط نمبر ۵) کے تحت گزر چکی ہے۔)

دیکھئے سورۃ الاخلاص میں بھی ضمیر پہلے لائے ہیں اور ''کُفُوًا'' بعد میں۔ فرمایا:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴﴾ ''اور اس کے لیے کوئی ہمسر نہیں ہے۔''

سورۃ النحل کی آیت میں سورۃ النساء کی مانند پہلے کسی خاص گروہ کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ کی عمومی گواہی کا تذکرہ ہے جو سب پر ہوگی' چاہے وہ نیک ہوں یا بد' یعنی وہ تمام لوگ جن کی طرف نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی گئی۔

ایک دوسری بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سورۃ النساء کی آیات کے فواصل (یعنی آیت کا آخری لفظ) منصوب چلے آ رہے ہیں۔ (جیسے قَرِيْنًا' عَلِيْمًا' عَظِيْمًا) اور اس لحاظ سے ''شَهِيْدًا'' بھی انہی فواصل کے مطابق آخر میں آیا ہے۔ اس کے بالمقابل سورۃ النحل کے فواصل ''تَشْكُرُوْنَ' يُؤْمِنُوْنَ' مُسْلِمِيْنَ'' کے وزن پر آ رہے ہیں اور اس اعتبار سے ''شَهِيْدًا'' کا بیچ آیت میں آنا ہی مناسب تھا۔

(۶۸) آیت ۴۳:

﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳﴾

''تو پھر اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لو' بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔''

اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۶ میں ارشاد فرمایا:

﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶﴾

''اور پھر (مٹی) سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا لیکن یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر ڈالے تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔''

یہاں تین سوالات اُبھرتے ہیں:

(۱) سورۃ المائدۃ میں ''مِنْهُ'' کا اضافہ ہے؟

(۲) دونوں آیات کا آخری حصہ مختلف ہے؟

(۳) سورۃ المائدۃ کی آیت میں بہ نسبت سورۃ النساء کے طوالت پائی جاتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ نزولی ترتیب اور مصحف میں سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بھی سورۃ النساء کے بعد میں آئی ہے' اور اس میں ''مِنْهُ'' یعنی ''مٹی سے'' کا اضافہ سورۃ النساء کی آیت کے اجمال کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی ایسی چیز ہی کا بیان مطلوب ہوتا ہے جو پہلے ذکر کی گئی ہو۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیت شراب کے حرام ہونے سے قبل نازل ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو کہ آیت تیمّم سے پہلے یہ آیت آئی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (آیت ۴۳)

''اے ایمان والو! تم نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشہ میں ہو تا کہ تم جان سکو کہ تم کیا پڑھ رہے ہو۔''

یہ بات واضح ہے کہ اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی' اس لیے بتایا جا رہا ہے کہ اگر نشہ طاری ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ' گویا اس صورت میں اوّل وقت سے نماز کی ادائیگی میں تاخیر ہو سکتی تھی اور پھر ثواب میں کمی بھی واقع ہو سکتی تھی اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ نماز اپنے آخری وقت میں یا وقت کے ختم ہونے کے بعد ادا ہو جو کہ گناہ کا باعث بھی ہو سکتی تھی' اور اس لیے یہ مناسب ہوا کہ آیت تیمّم کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے عفو اور غفور ہونے کا تذکرہ ہو جائے۔ اور جہاں تک سورۃ المائدۃ کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں آیت تیمّم سے قبل اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ذبیحہ کے حلال ہونے کا ذکر ہے' فرمایا:

﴿اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۪ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (آیت ۵)

''آج تمہارے لیے تمام طیّب چیزیں حلال کی گئیں' اور ایسے ہی ان لوگوں کا کھانا (یعنی ذبیحہ) جنہیں کتاب دی گئی تھی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے' اور ایسے ہی (حلال ہیں) مؤمن پاک باز عورتیں اور وہ پاک باز عورتیں جو تم سے قبل اہل کتاب میں سے ہیں۔''

اور پھر ان چیزوں کا بھی ذہن میں خیال رہے جیسے چربی وغیرہ جو اُن پر حرام کی گئی تھیں اور وہ سختیاں جو اُن پر عائد کی گئی تھیں' جو کہ سب اس امت سے اٹھالی گئی تھیں' اور اس اعتبار سے مناسب ہوا کہ آیت کے آخری حصہ میں اس امت کی تطہیر اور اتمامِ نعمت اور ضرورتِ شکر کا بیان ہو جائے اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر دو آیات کا آخری حصہ اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل مناسب جگہ پر آیا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ کے مضمون میں اطناب (تفصیل) ہے جبکہ سورۃ النساء کی آیت میں ایجاز (اختصار) ہے۔

سورۃ النساء کی آیت کے شروع ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ سے لے کر ﴿وَاَیْدِیْكُمْ﴾ تک کے کلمات گن لیجیے اور پھر سورۃ المائدۃ کی آیت کے آغاز سے لے کر ﴿وَاَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ﴾ تک کے کلمات اور حروف گن لیجیے تو معلوم ہوگا کہ سورۃ المائدۃ کی آیت میں سورۃ النساء کی آیت کے مقابلے میں تیس سے زائد حرف ہیں' اور اس لحاظ سے سورۃ النساء کی آیت کے اختتامی کلمات ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾﴾ مختصر ہیں بمقابلہ سورۃ المائدۃ کی آیت کے آخری حصہ کے' جہاں فرمایا: ﴿مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۶﴾﴾ یعنی ایجاز کے مقابلے میں ایجاز اور اطناب کے مقابلے میں اطناب کو ملحوظ رکھا گیا۔

اور اگر پھر یہ کہا جائے کہ کتاب اللہ میں زیادہ تر ایجاز کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے تو پھر سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں یہ تفصیل کیا معنی رکھتی ہے؟ —— جواباً میں کہوں گا کہ سورۃ المائدۃ کے آغاز ہی سے حرام وحلال کا تذکرہ ہے۔ مطعومات میں کیا حرام ہیں اور کیا حلال ہیں' بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا اور اس تفصیل کا تقاضا تھا کہ آیت کے آخری حصے میں بھی تفصیل کی رعایت رکھی گئی' جبکہ سورۃ النساء کی آیت سے قبل ایسی کوئی تفصیل نہ تھی اس لیے وہاں ایجاز سے کام لیا گیا۔ واللہ اعلم!

(۶۹) آیت ۴۸:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾﴾

''اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ (دوسرے گناہوں) کو معاف کرتا ہے جس کے لیے چاہے' اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے تو وہ ایک بہت بڑا جھوٹ گھڑتا ہے۔''

اور پھر اسی سورت کی آیت ۱۱۶ میں اسی آیت کو دہرایا گیا' لیکن آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾

''اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے تو وہ گمراہی میں بہت دور چلا گیا ہے۔''

سوال واضح ہے کہ دونوں آیات ایک جیسی ہیں لیکن دونوں کا آخری ٹکڑا مختلف ہے تو کیوں؟ جواب یہ ہے کہ پہلی آیت سے قبل اہل کتاب کی تحریفات اور سرکشیوں کا تذکرہ ہے۔ آغاز ہوتا ہے آیت ۴۴ سے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾﴾

''کیا تم نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا اور وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستے سے بھٹک جاؤ!''

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (آیت ۴۶)

''اور جو لوگ یہودی ہوئے' ان میں سے کچھ کلام کو اس کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔''

یعنی ان کے جھوٹ اور افتراء کا بیان ہوا۔ اور پھر فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾

اور پھر شرک کے انتہائی ظاہری وصف افتراء کا ذکر مناسب تھا کہ اہلِ کتاب اس صفت کے پوری طرح حامل تھے۔ چنانچہ آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾﴾

سورۃ النساء کی دوسری مماثل آیت سے قبل اہل کتاب کا نہیں بلکہ منافقین کا ذکر ہے۔ آغاز ہوتا ہے آیت ۱۰۵ سے' فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰہُ ؕ وَلَا تَکُنۡ لِّلۡخَآئِنِیۡنَ خَصِیۡمًا ﴿۱۰۵﴾﴾

''ہم نے تمہارے اوپر کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ' تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرسکو اس (وحی) کی روشنی میں جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اور تم خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کرو۔''

پھر فرمایا:

﴿وَلَا تُجَادِلۡ عَنِ الَّذِیۡنَ یَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۰۷)

''اور جو لوگ اپنے نفوس سے خیانت کرتے ہیں' ان کی طرف سے حجت بازی نہ کرو۔''

اور مذکورہ آیت سے قبل ایسے لوگوں کے جھگڑالو ہونے کا بھی تذکرہ کیا' فرمایا:

﴿وَمَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی﴾ (آیت ۱۱۵)

''اور وہ شخص جو ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول سے جھگڑا کرتا ہے۔''

تو یہاں نہ ان کے جھوٹ کا ذکر ہے نہ افتراء کا' بلکہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے منافقین کے نفاق کا ذکر ہے' کذب وافتراء کا نہیں۔ اس لیے یہاں ''فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا'' کہنا بالکل مناسب تھا۔ یعنی ہر دو آیات کا آخری ٹکڑا اپنے ماسبق کے عین مطابق ہے' اور اگر اس کے اُلٹ ہوتا تو غیر مناسب ہوتا' واللہ اعلم!

(۷۰) آیت ۶۱:

﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس (بات) کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف' تو تم دیکھو گے کہ منافق تم سے کیسے کتراتے ہیں۔''

اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا ؕ﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس (بات) کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں: ہمیں وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء (واَجداد) کو پایا ہے۔''

(نوٹ: یہاں مصنف کو شدید سہو ہوا ہے اور وہ ان دونوں آیات میں تقابل اس بنیاد پر کر رہے ہیں کہ سورۃ المائدۃ کی آیت میں صرف ''مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ'' وارد ہوا ہے ''اِلَی الرَّسُوۡلِ'' نہیں کہا گیا۔ تو ایسا کیوں ہے؟ اس لیے ہم ان کے مزعومہ سوال سے احتراز کرتے ہوئے صرف ان دونوں آیات کی تفسیر پیش کر رہے ہیں جو کہ مصنف کے قلم سے نکلی ہے۔ مترجم)

دونوں آیتوں میں جو لوگ مخاطب ہیں وہ مختلف ہیں۔ پہلی آیت ایک منافق اور ایک یہودی کے بارے

میں ہے جو فیصلے کے لیے کعب بن الاشرف کے پاس آئے تھے اور اس کے فیصلے پر راضی تھے' تو یہاں پر مراد منافقین ہیں جو ظاہر تو یہ کر رہے تھے کہ وہ اس وحی پر ایمان لائے ہیں جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر اُتری ہے اور ان سے قبل موسیٰ علیہ السلام پر اُتری ہے' اور چونکہ ان کا یہ دعویٰ صرف زبان کی حد تک تھا اس لیے ان کے اس قول کو ''زَعَم'' کہہ کر تعبیر کیا اور کعب بن الاشرف کے پاس جانے کو ''طاغوت'' کی طرف جانے سے تعبیر کیا۔ چنانچہ ایک آیت قبل ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ﴾ (النساء: ٦٠)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو کچھ تم پر اترا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے اترا ہے' وہ اس پر ایمان لائے ہیں' اور وہ تو فیصلے کے لیے طاغوت کی طرف جانا چاہتے ہیں' حالانکہ انہیں تو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کا انکار کر دیں۔''

یہود کو تو اس بات کا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اپنے علماء کو جھٹلائیں الا یہ کہ وہ تحریف کے مرتکب ہوں' بلکہ یہ حکم تو اہلِ ایمان کو اس وقت دیا گیا تھا جب ان کی تحریف اور احکامات الٰہی میں تبدیلی واضح ہو گئی تھی۔ اور پھر مذکورہ آیت آتی ہے جس میں کہا گیا کہ جب انہیں اس وحی کی طرف بلایا جاتا ہے جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ اللہ کے رسول کی طرف آئیں تاکہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر سکیں' بلکہ ان سے بھاگ کر کعب بن الاشرف یا کسی دوسرے کاہن کی طرف جانا شروع کر دیتے ہیں۔

اور سورۃ المائدۃ کی آیت میں جاہلیت کے وہ لوگ مراد ہیں جو کئی کفریہ باتوں کے مرتکب ہوئے تھے جن میں عمرو بن لُحَیّ کی متابعت میں بتوں کی پوجا شامل تھی اور ان لوگوں کی بھی جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں تحریف اور تبدیلی کی تھی اور اپنی طرف سے بحیرۃ' سائبہ' وصیلہ اور حام کی حرمت گھڑ لی تھی۔

اب ذرا ان خود ساختہ محرمات کا بیان ہو جائے۔

بَحِیرۃ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس نے دس بچے جنے ہوں' علامت کے طور پر اس کے کان کی لمبائی میں سوراخ کر دیا جاتا تھا' اُسے کھانے پینے اور چرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا اور اُس کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھایا جاتا تھا۔ مرنے پر صرف مرد اس کو کھا سکتے تھے' عورتوں پر اس کا کھانا حرام تھا۔

سَائِبۃ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو اوپر تلے بارہ مادہ اونٹنیاں پیدا کر چکی ہوتی تھی کہ جن میں کوئی نر نہ ہو' ایسی اونٹنی کو دیوتاؤں کے لیے خاص کر دیا جاتا تھا۔

وَصِیلۃ اُس بھیڑ کو کہتے تھے کہ جس نے تین یا پانچ مرتبہ بچے پیدا کیے ہوں' اور اگر آخری بچہ نر ہو تو اسے دیوتاؤں کے نام ذبح کر دیا جاتا۔ لیکن اگر آخری ولادت میں نر کے ساتھ مادہ بھی ہو تو پھر اسے ذبح نہ کیا جاتا' بلکہ کہا جاتا کہ اس مادہ نے اپنے بھائی کو ذبح ہونے سے بچا لیا ہے' اور وصیلہ اس معنی میں کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر آئی ہے۔

حام اُس اونٹ کو کہا جاتا تھا جس نے دس اونٹنیوں کو بار آور کیا ہو‘ یا اس کی پشت سے دس بچے پیدا ہوئے ہوں‘ ایسا اونٹ بھی کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حام یا حامی اس لیے کہا گیا کہ گویا اس نے اپنی پشت کو بار برداری سے بچالیا۔

اور پھر ان لوگوں کے لیے کہا گیا کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے عاری ہیں۔ اور پھر جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اس (وحی) کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمیں وہ کچھ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واَجداد کو پایا۔ (کیا وہ ان کی پیروی کرتے رہیں گے؟) چاہے ان کے آباء واَجداد نہ کچھ جانتے ہوں اور نہ ہی ہدایت یافتہ ہوں۔

(۷۱) آیت ۸۷:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾﴾ ’’اور اللہ سے بڑھ کر سچ بات کہنے والا کون ہوگا!‘‘

اور پھر آیت ۱۲۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾﴾ ’’اور اللہ سے بڑھ کر سچ قول کہنے والا کون ہوگا!‘‘

’’اور اللہ سے بڑھ کر سچ قول کہنے والا کون ہوگا۔‘‘

سوال کرنے والا یہ سوال کرسکتا ہے کہ دونوں آیتوں کے آخری لفظ میں اختلاف پایا گیا ہے جبکہ دونوں آیتیں آخرت کے امور کے بارے میں ہیں۔ پہلی آیت سے قبل یہ الفاظ ہیں:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ﴾

’’اللہ وہ ہے کہ جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ یقیناً تمہیں قیامت کے دن اکٹھا کرے گا‘ اس میں کوئی شک نہیں۔‘‘

اور دوسری آیت کے شروع میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ﴾

’’اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے‘ ہم انہیں ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے‘ اور یہ اللہ کا وعدہ حق ہے۔‘‘

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیت کے لفظ ’’قِيْلًا‘‘ کا ربط اس سے پہلی والی آیت سے ہے جہاں کہا گیا: ﴿وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا﴾ ور پھر کہا: ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ —— گویا ’’قِيْلًا‘‘ کا لفظ ’’وَعْدًا‘‘ کے معنوں میں ہے‘ یعنی اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے میں اور کون سچا ہوگا؟ وہ وعدے جو جنت کی نعمتوں اور عظیم احسانات سے متعلق ہیں۔ یہاں دیکھئے کہ ’’قِيْلًا‘‘ کا لفظ ’’وَعْدًا‘‘ اور ’’حَقًّا‘‘ کے وزن پر ہے اور جس طرح ان دونوں کلمات میں بیچ کا حرف ساکن ہے۔ اسی طرح ’’قِيْلًا‘‘ بھی بیچ میں ساکن حرف رکھتا ہے۔ اس کے حروف بھی اتنے ہی ہیں جتنے وَعْد اور حَقّ کے ہیں۔ گویا مصدر کا تکرار ہے‘ لیکن عربی اسلوب کے مطابق اسی مصدر کا نہیں

بلکہ اس سے ملتا جلتا کلمہ لایا گیا ہے جو معنی کے اعتبار سے بھی مشابہت رکھتا ہے۔ گویا یہ تینوں مصادر ہم وزن ہیں' زبان پر خفیف ہیں' ثقیل نہیں' اور تینوں کا ساتھ ساتھ آنا بڑا اہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔

اور جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے تو وہاں ایسی کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی' ﴿لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ کہہ کر مستقبل کی خبر دی جا رہی ہے کہ موت کے بعد اٹھایا جائے گا' تمام مخلوقات کو اکٹھا کیا جائے گا تاکہ انہیں ان کے اچھے برے کاموں کا بدلہ دیا جائے۔

یہاں صرف ایک خبر دی جا رہی ہے' جیسے سورۂ سبا میں کفار کا قول نقل کیا گیا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۷﴾

''اور جنہوں نے کفر کیا تھا انہوں نے کہا: ہم تمہیں ایسے آدمی کے بارے میں بتائیں جو یہ کہتا ہے کہ جب تم ہر طرح سے پھاڑ دیے جاؤ گے تو پھر (ایک دن) نئی خِلقت دیے جاؤ گے!''

یہاں بھی صرف خبر ہے۔ اس لیے سورۃ النساء کی پہلی آیت میں ''حَدِيْثًا'' کا آنا مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

(۷۲) آیت ۱۱۵:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝۱۱۵﴾

''اور جو شخص رسول سے جھگڑا کرتا ہے ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد اور مؤمنین کے راستے کے علاوہ کوئی (راستہ) اختیار کرتا ہے تو جتنا پیچھے وہ جانا چاہتا ہے ہم اتنا پیچھے اسے کر دیتے ہیں اور جہنم تک پہنچا دیتے ہیں' اور یہ بدترین انجام ہے۔''

سورۃ الانفال کی آیت ۱۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۳﴾

''اور جو اللہ اور اُس کے رسول سے جھگڑا کرتا ہے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اور سورۃ الحشر کی آیت ۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴﴾

''اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ اور جو اللہ سے جھگڑا کرتا ہے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادغام (دو حرفوں کو ملا کر ایک مشدد حرف بنانا) اور فک (دونوں حرفوں کو جدا جدا رہنے دینا) دونوں فصاحت سے خالی نہیں ہیں تو سورۃ الحشر میں لفظ ''شَاقُّوا'' اور ''يُشَاقِّ'' ادغام کے ساتھ آیا ہے جبکہ پہلی دو سورتوں میں جدا جدا بیان ہوا ہے' یعنی ''يُشَاقِقِ'' کہا گیا' تو ایسا کیوں ہے؟ —— جواب اس کا یہ ہے کہ ادغام اصل نہیں ہے بلکہ بطور تخفیف لایا جاتا ہے' اس لیے سورۃ النساء میں اصل کے مطابق ہے یعنی دونوں

حرفوں کو جدا جدا لایا گیا اور وہاں ایسا کوئی سبب نہ تھا کہ جس کی وجہ سے وہاں تخفیف کے طور پر اس لفظ کو ادغام کے ساتھ لایا جاتا' جبکہ سورۃ الحشر میں پہلے یہی لفظ ماضی کے صیغہ کے ساتھ بطور ادغام لایا گیا تھا۔ فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ﴾

اور ماضی کے صیغہ میں یہ لفظ بغیر ادغام کے نہیں سنا گیا' تو اس مناسبت سے اگلی آیت میں بھی ادغام کے ساتھ ہی اس لفظ کو لایا گیا' فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ﴾ (آیت ۴)

(نوٹ: یہاں پر ایک لغوی بحث ہے جسے صرف اہل لغت سمجھ سکتے ہیں' اس لیے اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔)

(۷۳) آیت ۱۲۸:

﴿وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۲۸﴾

''اور اگر ایک عورت اپنے شوہر سے سختی یا بے رخی کا اندیشہ رکھتی ہو تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ دونوں اپنے مابین صلح صفائی کا راستہ اختیار کر لیں' اور صلح کرنا بہتر ہے' اور نفوس میں طمع پایا جاتا ہے۔ اور اگر تم اچھا طرزِ عمل اختیار کرو اور تقویٰ کو اپناؤ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بخوبی باخبر ہے۔''

اور اس سے اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۲۹﴾

''اور تم اپنی خواہش کے باوجود عورتوں میں کبھی عدل نہ کر پاؤ گے' اس لیے تم (ایک عورت کی طرف) پوری طرح نہ جھک جاؤ کہ اُس (دوسری عورت) کو لٹکتی ہوئی چھوڑ دو۔ اور اگر تم صلح صفائی کر لو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔''

یہاں دو سوال اٹھتے ہیں کہ پہلی آیت میں ﴿وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ کہا جبکہ دوسری آیت میں ﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ کہا گیا۔ اور یہ کہ پہلی آیت کا اختتام ''خَبِيْرًا'' پر ہو رہا ہے اور دوسری آیت کا ''غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'' پر' تو اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ پہلی آیت کا تعلق عورت اور اس کے شوہر کے مابین تعلقات سے ہے۔ اگر عورت کو اندیشہ ہو کہ وہ اسے چھوڑ دے گا اور وہ خود چاہتی ہو کہ اس کے ساتھ اُلفت اور محبت کے ساتھ رہے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اگر وہ اپنا کچھ حق چھوڑ دیتی ہے' یعنی اپنی سوکن کو اپنی باری دے دے یا اپنے حظِّ نفس کو چھوڑ دے' جیسے اُمّ المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا' تو اُسے ایسا کرنے پر کوئی گناہ نہ ہوگا اور مرد کو یہ بات قبول کرنے پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اگرچہ نفسِ انسانی کی خصلت میں بخل پایا جاتا ہے اور کوئی بھی اپنے حق کو بالکل

چھوڑ دینے یا اس میں کمی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ اور اسی بات کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں:

﴿وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ﴾ ''اور نفوس میں طمع پایا جاتا ہے۔''

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا﴾ ''اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور تقویٰ اختیار کرو''

یہاں میاں بیوی دونوں کو حسنِ سلوک اور تقویٰ کی طرف بلایا گیا ہے' گو شوہر کے لیے ان دونوں باتوں کا اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے' اور پھر تقویٰ اور احسان کا تقاضا ہے کہ دونوں صبر کریں' ایک دوسرے کا لحاظ کریں اور خوب جان لیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے چھپے ڈھکے تمام معاملات کو بخوبی جانتا ہے۔

اور دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ﴾

''اور اگر تم چاہو بھی تو عورتوں کے درمیان پورا پورا انصاف ہرگز نہیں کر سکتے۔''

اس لیے کہ وہ دلوں کے مالک نہیں ہیں اور نہ ہی انسان کے بس میں ہے کہ دل کو پاک صاف رکھے یا بگاڑ دے' اور اگر بالفرض وہ بات چیت' حسنِ ملاقات' مسکراتے چہرے' الفت کی نظر اور باری کے پورا کرنے میں عدل قائم کر بھی سکے' تب بھی دلی میلان میں تمام بیویوں کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ نہیں کر سکتا' اس لیے فرما دیا:

﴿فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ﴾ ''پس پوری طرح ایک طرف جھکاؤ نہ رکھو۔''

بلکہ اپنی سی کوشش میں لگا رہے کہ برابری کا سلوک ہوتا رہے۔ نبی ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ! یہ وہ تقسیم ہے جو میرے ہاتھ میں ہے اور اے اللہ! جو میرے ہاتھ میں نہیں' اس پر مجھے ملامت نہ کر!!'' اور اسی لیے فرمایا:

﴿فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ ؕ﴾ ''تو پھر تم اسے لٹکا کے رکھو۔''

یعنی نہ تو ڈھنگ سے رکھو اور نہ ہی طلاق دو۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا﴾ ''اور اگر تم اصلاح کر سکو اور تقویٰ اختیار کر سکو۔''

مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اصلاحِ احوال کی کوشش میں لگے رہو' اور پھر جو بھی ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرنے والا ہے۔

پہلی آیت کے مضمون کا تقاضا تھا کہ اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے تمام اعمالِ ظاہرہ اور باطنہ پر باخبر ہونے کا تذکرہ کیا جائے اور دوسری آیت میں دل کے میلان میں پوری طرح عدل نہ ہو پانے کا تقاضا تھا کہ اللہ کی مغفرت کا ذکر کیا جائے' کیونکہ اگر اس بات پر اللہ تعالیٰ سزا دینے پر آئیں تو ایسا انسان تو پھر مارا گیا' اور یوں پہلی آیت کے آخر سے قبل حسنِ سلوک کا اور دوسری آیت میں اصلاحِ احوال کا تذکرہ بالکل مناسب تھا' واللہ اعلم!

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الاعراف

آیات ۱۳۸ تا ۱۴۳

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی
اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ
وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰھًا وَّھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾
وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ
نِسَآءَکُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً وَّاَتْمَمْنٰھَا
بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖٓ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ۚ وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْہِ ھٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ
وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَہٗ رَبُّہٗ ۙ قَالَ
رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ
فَسَوْفَ تَرٰنِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ
قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۴۳﴾

ت ب ر

تَبِرَ یَتْبَرُ (س) تَبَرًا : ہلاک ہونا' برباد ہونا۔

تَبَارٌ (اسم ذات) : تباہی' بربادی۔ ﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾﴾ (نوح) ''اور تو زیادہ نہ کر ظالموں کو مگر تباہی میں۔''

تَبَّرَ یُتَبِّرُ (تفعیل) تَتْبِیْرًا : تباہ کرنا' برباد کرنا۔ ﴿وَکُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا ﴿۳۹﴾﴾ (الفرقان) ''اور سب کو ہم نے برباد کیا جیسا برباد کرنے کا حق ہے۔''

مُتَبَّرٌ (اسم المفعول اور ظرف) : (۱) برباد کیا ہوا (۲) برباد شدہ جگہ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۳۹۔

ج ل و

جَلَا یَجْلُوْ (ن) جَلْوًا : کسی چیز کو آشکارا کرنا' نمایاں کرنا۔

جَلَاءً : کسی کو شہر سے نکالنا' جلاوطن کرنا۔ ﴿وَلَوْلَا اَنْ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَھُمْ فِی الدُّنْیَا ط﴾ (الحشر:۳) ''اگر نہ ہوتا کہ لکھا اللہ نے ان پر جلاوطن کرنا تو وہ ضرور عذاب دیتا ان کو دنیا میں۔''

جَلّٰی یُجَلِّیْ (تفعیل) تَجْلِیَۃً : کسی چیز کو خوب روشن کرنا۔ ﴿وَالنَّھَارِ اِذَا جَلّٰھَا ﴿۳﴾﴾ (الشمس) ''قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن کر دے اس کو۔''

تَجَلّٰی یَتَجَلّٰی (تفعّل) تَجَلٍّ : خوب روشن ہونا' جلوہ افروز ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۳۔

د ک ک

دَکَّ یَدُکُّ (ن) دَکًّا : کسی چیز کو کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کرنا' ہموار کرنا۔ ﴿وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً ﴿۱۴﴾﴾ (الحاقۃ) ''اور اٹھائی جائے گی زمین اور پہاڑ پھر دونوں کو کوٹ کر ہموار کیا جائے گا' یک بارگی ہموار کرنا۔''

دَکٌّ (اسم ذات بھی ہے) : ہموار زمین۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۳۔

دَکَّآءُ : نرم مٹی کا ٹیلہ۔ ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ ج﴾ (الکھف:۹۸) ''پھر جب آئے گا میرے رب کا وعدہ تو وہ بنا دے گا اس کو ایک نرم مٹی کا ٹیلہ۔''

خ ر ر

خَرَّ یَخِرُّ (ض) خَرًّا : بلندی سے پستی میں گرنا۔ آیت زیر مطالعہ ۱۴۳۔

ترکیب

(آیت ۱۳۸) ''جَاوَزَ'' (مفاعلہ) کے معنی ہیں دریا کو پار کرنا۔ با کے صلہ کے ساتھ معنی ہو جاتے ہیں کسی کو پار کرانا۔ ''قَوْمٍ'' نکرہ مخصوصہ ہے جبکہ ''یَعْکُفُوْنَ'' اس کی خصوصیت اور حال ہے۔ (آیت ۱۳۹) ''مَاھُمْ'' مبتدأ مؤخر ہے، ''مُتَبَّرٌ'' اس کی خبر مقدم ہے اور ''فِیْہِ'' متعلق خبر ہے۔ پھر یہ پورا جملہ ''اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ'' کی خبر ہے۔ اسی طرح ''مَا'' مبتدأ مؤخر ہے، ''بٰطِلٌ'' اس کی خبر مقدم ہے اور جملہ فعلیہ ''کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'' متعلق خبر ہے' اس لیے اس کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ (آیت ۱۴۱) ''سُوْٓءَ الْعَذَابِ'' مرکب اضافی ہے لیکن اس کا ترجمہ مرکبِ توصیفی میں ہوگا (دیکھیں آیت ۲۰/۴۹' نوٹ ۳) ''عَظِیْمٌ'' کی رفع بتا رہی ہے کہ یہ ''بَلَآءٌ'' کی صفت ہے' اگر ''رَبِّ'' کی ہوتی تو ''عَظِیْمٍ'' آتی۔

ترجمہ:

وَجٰوَزْنَا : اور ہم نے پار کرایا — بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ : بنی اسرائیل کو

الْبَحْرَ : سمندر کے
عَلٰی قَوْمٍ : ایک ایسی قوم پر
عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ : اپنے کچھ بتوں پر
یٰمُوْسَی : اے موسیٰؑ
لَّنَآ : ہمارے لیے
کَمَا : جیسے کہ
اٰلِھَۃٌ : کچھ اِلٰہ ہیں
اِنَّکُمْ : بے شک تم لوگ
تَجْھَلُوْنَ : جو غلط عقائد رکھتی ہے
ھٰٓؤُلَآءِ : یہ
مَّا : وہ
فِیْہِ : جس میں ہیں
مَّا : وہ، جو
قَالَ : (موسیٰؑ نے) کہا
غَیْرَ اللّٰہِ : اللہ کے علاوہ کو
اِلٰھًا : بطور الٰہ
ھُوَ : اُس نے
عَلَی الْعٰلَمِیْنَ : تمام جہانوں پر
اَنْجَیْنٰکُمْ : ہم نے تمہیں نجات دی
یَسُوْمُوْنَکُمْ : وہ تکلیف دیتے تھے تم کو
یُقَتِّلُوْنَ : وہ قتل کرتے تھے
وَیَسْتَحْیُوْنَ : اور زندہ رکھتے تھے
وَفِیْ ذٰلِکُمْ : اور اس میں
مِّنْ رَّبِّکُمْ : تمہارے رب (کی طرف) سے
وَوٰعَدْنَا : اور ہم نے وعدہ کیا
ثَلٰثِیْنَ لَیْلَۃً : تیس راتوں کا
بِعَشْرٍ : دس سے
مِیْقَاتُ رَبِّہٖٓ : انؑ کے رب کا طے شدہ وقت

فَاَتَوْا : تو وہ پہنچے
یَّعْکُفُوْنَ : جو چپکے بیٹھے ہوئے تھے
قَالُوْا : انہوں نے کہا
اجْعَلْ : آپؑ بنا دیں
اِلٰھًا : ایک الٰہ
لَھُمْ : ان کے لیے
قَالَ : (موسیٰؑ نے) کہا
قَوْمٌ : ایک ایسی قوم ہو
اِنَّ : یقیناً
مُتَبَّرٌ : برباد کیا ہوا ہے
ھٰٓؤُلَآءِ : یہ لوگ
وَبٰطِلٌ : اور باطل ہے
کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ : یہ لوگ کرتے ہیں
اَ : کیا
اَبْغِیْکُمْ : میں چاہوں تمہارے لیے
وَّ : حالانکہ
فَضَّلَکُمْ : فضیلت دی ہے تم کو
وَاِذْ : اور جب
مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ : فرعون کے پیروکاروں سے
سُوْٓءَ الْعَذَابِ : برے عذاب کی
اَبْنَآءَکُمْ : تمہارے بیٹوں کو
نِسَآءَکُمْ : تمہاری عورتوں کو
بَلَآءٌ : ایک آزمائش تھی
عَظِیْمٌ : ایک بڑی (آزمائش)
مُوْسٰی : موسیٰؑ سے
وَّاَتْمَمْنٰھَا : اور ہم نے مکمل کیا انہیں
فَتَمَّ : تو پورا ہوا
اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً : چالیس راتوں کا

وَقَالَ : اور کہا
لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ : اپنے بھائی ہارونؑ سے
فِیْ قَوْمِیْ : میری قوم میں
وَلَا تَتَّبِعْ : اور پیروی مت کرنا
وَلَمَّا : اور جب
مُوْسٰی : موسیٰؑ
وَكَلَّمَهٗ : اور کلام کیا انؑ سے
قَالَ : تو انہوںؑ نے کہا
اَرِنِیْٓ : تو مجھے دکھا
اِلَیْكَ : تیری طرف
لَنْ تَرٰىنِیْ : تو ہرگز نہیں دیکھے گا مجھ کو
انْظُرْ : تو دیکھ
فَاِنِ : پھر اگر
مَكَانَهٗ : اپنی جگہ پر
تَرٰىنِیْ : تو دیکھے گا مجھ کو
تَجَلّٰی : روشن ہوا
لِلْجَبَلِ : اس پہاڑ کے لیے
دَكًّا : ہموار زمین
مُوْسٰی : موسیٰؑ
فَلَمَّآ : پھر جب
قَالَ : تو انہوںؑ نے کہا
تُبْتُ اِلَیْكَ : میں توبہ کرتا ہوں
اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ : ایمان لانے والوں کا سب سے پہلا ہوں

مُوْسٰی : موسیٰؑ نے
اخْلُفْنِیْ : تو میرے پیچھے رہ
وَاَصْلِحْ : اور اصلاح کر
سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ : نظم بگاڑنے والوں کے راستے کی
جَآءَ : آئے
لِمِیْقَاتِنَا : ہماری طے شدہ جگہ پر
رَبُّهٗ : انؑ کے رب نے
رَبِّ : اے میرے رب
اَنْظُرْ : تو میں دیکھوں
قَالَ : (اللہ نے) کہا
وَلٰكِنِ : اور لیکن
اِلَی الْجَبَلِ : اس پہاڑ کی طرف
اسْتَقَرَّ : وہ برقرار رہا
فَسَوْفَ : تو عنقریب
فَلَمَّا : پھر جب
رَبُّهٗ : انؑ کا ربّ
جَعَلَهٗ : تو اُس نے کر دیا اس کو
وَّخَرَّ : اور گر پڑے
صَعِقًا : بے ہوش ہو کر
اَفَاقَ : افاقہ ہوا
سُبْحٰنَكَ : تیری پاکیزگی ہے
وَاَنَا : اور میں

نوٹ: آیت ۱۴۲ میں تیس دن کے بجائے تیس راتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں مہینے قمری ہوتے ہیں اور قمری مہینہ چاند دیکھنے سے شروع ہوتا ہے' جو کہ رات ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے قمری مہینہ رات سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کی ہر تاریخ غروب آفتاب سے شمار ہوتی ہے۔ جتنے آسمانی

مذاہب ہیں ان سب کا حساب اسی طرح قمری مہینوں سے شروع ہوتا ہے اور تاریخ غروب آفتاب سے شمار کی جاتی ہے۔ ابن عربی کا قول ہے کہ شمسی حساب دنیوی منافع کے لیے ہے اور قمری حساب اداءِ عبادات کے لیے ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۴۴ تا ۱۴۷

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ
مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ
شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾
سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ
سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ
الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

ل و ح

لَاحَ يَلُوْحُ (ن) لَوْحًا : کسی چیز کا نمایاں ہونا۔

لُوْحًا : گرم ہونا' پیاسا ہونا۔

لَوْحٌ ج اَلْوَاحٌ (اسم ذات) : ہر چوڑی چیز جیسے لکھنے کی تختی' کشتی کے تختے وغیرہ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۵ اور ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾﴾ (البروج) ''بلکہ وہ قرآن مجید ہے ایک محفوظ تختی میں۔'' ﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾﴾ (القمر) ''اور ہم نے سوار کیا اس کو کچھ تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر۔''

لَوَّاحٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ) : بہت گرم ہونے والا' جھلسنے والا۔ ﴿لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾﴾ (المدثر) ''جھلسنے والی ہے کھال کو۔''

ترکیب

(آیت ۱۴۵) فعل امر ''وَاْمُرْ'' کا جواب امر ہونے کی وجہ سے ''يَاْخُذُوْا'' مجزوم ہوا ہے۔ ''اُوْرِيْكُمْ'' میں واو زائدہ ہے اور قرآن مجید کا مخصوص املا ہے۔ (آیت ۱۴۷) ''بِاٰيٰتِنَا'' کی ''بِ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''لِقَاۗءِ'' حالت جر میں آیا ہے۔

ترجمہ:

قَالَ : (اللہ نے) کہا — يٰمُوْسٰٓى : اے موسیٰؑ

اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ : میں نے ترجیح دی تجھ کو — عَلَى النَّاسِ : لوگوں پر

بِرِسٰلٰتِیْ : اپنے پیغام کے لیے
فَخُذْ : پس تو پکڑ
اٰتَیْتُكَ : میں نے دیا تجھ کو
مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ : شکر کرنے والوں میں سے
لَهٗ : اس کے لیے
مِنْ كُلِّ شَیْءٍ : سب چیزوں میں سے
وَّتَفْصِیْلًا : اور تفصیل ہوتے ہوئے
فَخُذْهَا : پس تو پکڑ اس کو
وَّاْمُرْ : اور تو حکم دے
یَاْخُذُوْا : کہ وہ لوگ پکڑیں
سَاُوْرِیْكُمْ : میں دکھاؤں گا تم لوگوں کو
سَاَصْرِفُ : میں پھیر دوں گا
الَّذِیْنَ : ان لوگوں کو جو
فِی الْاَرْضِ : زمین میں
وَاِنْ : اور اگر
كُلَّ اٰیَةٍ : ساری نشانیاں
بِهَا : ان پر
یَّرَوْا : وہ دیکھیں
لَا یَتَّخِذُوْهُ : تو نہیں پکڑیں گے اس کو
وَاِنْ : اور اگر
سَبِیْلَ الْغَیِّ : گمراہی کے راستے کو
سَبِیْلًا : بطور راستے کے
بِاَنَّهُمْ : بسبب اس کے کہ انہوں نے
بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
عَنْهَا : ان سے
وَالَّذِیْنَ : اور جنہوں نے
بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں کو
حَبِطَتْ : اکارت ہوئے

وَبِكَلَامِیْ : اور اپنے کلام کے لیے
مَآ : اُس کو جو
وَكُنْ : اور تو ہو جا
وَكَتَبْنَا : اور ہم نے لکھا
فِی الْاَلْوَاحِ : تختیوں میں
مَّوْعِظَةً : نصیحت ہوتے ہوئے
لِّكُلِّ شَیْءٍ : ہر چیز کے لیے
بِقُوَّةٍ : قوت سے
قَوْمَكَ : اپنی قوم کو
بِاَحْسَنِهَا : اس کے بہترین کو
دَارَ الْفٰسِقِیْنَ : نافرمانی کرنے والوں کا گھر
عَنْ اٰیٰتِیَ : اپنی نشانیوں سے
یَتَكَبَّرُوْنَ : بڑے بنتے ہیں
بِغَیْرِ الْحَقِّ : حق کے بغیر
یَّرَوْا : وہ لوگ دیکھیں
لَّا یُؤْمِنُوْا : تو (بھی) ایمان نہیں لائیں گے
وَاِنْ : اور اگر
سَبِیْلَ الرُّشْدِ : ہدایت کے راستے کو
سَبِیْلًا : بطور راستے کے
یَّرَوْا : وہ دیکھیں
یَتَّخِذُوْهُ : تو پکڑیں گے اس کو
ذٰلِكَ : یہ ہے
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
وَكَانُوْا : اور وہ لوگ تھے
غٰفِلِیْنَ : غفلت برتنے والے
كَذَّبُوْا : جھٹلایا
وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ : اور آخرت کی ملاقات کو
اَعْمَالُهُمْ : ان کے اعمال

هَلْ يُجْزَوْنَ : انہیں کیا بدلہ دیا جائے گا اِلَّا : سوائے اس کے

مَا : جو كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : وہ لوگ کرتے تھے

نوٹ ۱: آیت ۱۴۵ میں بِاَحْسَنِهَا سے مراد احکامِ الٰہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم ہے جو عقل عام سے ہر وہ شخص سمجھ لے گا جس کی نیت میں فساد اور دل میں کجی نہ ہو۔ اور دَارُ الْفٰسِقِيْنَ دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ان قوموں کے آثارِ قدیمہ پر سے گزرو گے جنہوں نے اللہ کی بندگی اور اطاعت سے منہ موڑا۔ انہیں دیکھ کر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایسی روش اختیار کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: آیت ۱۴۷ میں حبطِ اعمال کا مطلب ہے کہ اعمال ضائع ہو گئے' بارآور نہ ہوئے اور لاحاصل رہے۔ (یعنی زندگی میں اگر کچھ نیکیاں کی بھی تھیں تو آخرت میں ان کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملا۔ مرتب) اللہ تعالیٰ کے ہاں انسانی سعی و عمل کے بارآور ہونے کا انحصار کلیتاً دو امور پر ہے۔ ایک یہ کہ وہ سعی و عمل اللہ کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی وہاں لازماً حبطِ اعمال واقع ہوگا۔ جس نے اللہ کی ہدایت سے منہ موڑ کر' باغیانہ انداز میں دنیا میں کام کیا' ظاہر ہے کہ وہ اللہ سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا وہ کس طرح آخرت میں پھل پائے گا۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۴۸ تا ۱۵۴

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا
يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا
اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ
مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ
رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ
اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ
بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚ وَفِيْ نُسْخَتِهَا
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

ح ل ی

حَلِيَتْ يَحْلٰى (س) حَلْيًا : عورت کا زیور پہننا۔

حِلْيَةٌ ج حُلِيٌّ : زیور۔ ﴿وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً﴾ (النحل: ۱۴) ''اور تاکہ تم لوگ نکالو اس سے کوئی

زیور۔'' اور زیر مطالعہ آیت ۱۴۸۔

حَلّٰی یُحَلِّیْ (تفعیل) تَحْلِیَۃً : زیور پہنانا' آراستہ کرنا۔﴿یُحَلَّوْنَ فِیْھَا اَسَاوِرَ مِنْ ذَھَبٍ﴾ (الکھف:۳۱) ''وہ لوگ آراستہ کیے جائیں گے اس میں سونے کے کنگنوں سے۔''

ج س د

جَسِدَ یَجْسَدُ (س) جَسَدًا :خون کا چپکنا' چمٹنا۔

جَسَدٌ (اسم ذات بھی ہے) : بے جان جسم' دھڑ' ڈھانچا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۸۔

خ و ر

خَارَ یَخُوْرُ (ن) خُوَارًا : گائے کا ڈکارنا' آواز کرنا۔

خُوَارٌ (اسم ذات بھی ہے) : گائے کی آواز۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۸۔

ء س ف

أَسِفَ یَأْسَفُ (س) اَسَفًا :افسوس کرنا' غمگین ہونا۔

اَسِفٌ (صفت) :افسوسناک' غمگین۔ زیر مطالعہ آیت ۱۵۰۔

اَسَفٰی (اسم ذات) :افسوس' غم۔﴿یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ﴾ (یوسف:۸۴) ''اے افسوس! یوسفؑ (کی جدائی) پر۔''

آسَفَ یُوْسِفُ (افعال) اِیْسَافًا: غمگین کرنا' غصہ دلانا۔﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْھُمْ﴾ (الزخرف:۵۵) ''پھر جب انہوں نے غصہ دلایا ہم کو تو ہم نے انتقام لیا ان سے۔''

ج ر ر

جَرَّ یَجُرُّ (ن) جَرًّا :کھینچنا' گھسیٹنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۵۰۔

ش م ت

شَمِتَ یَشْمَتُ (س) شَمَاتًا :کسی کی مصیبت پر خوش ہونا۔

اَشْمَتَ یُشْمِتُ (افعال) اِشْمَاتًا :کسی کو تکلیف دے کر دوسروں کو خوش کرنا' دشمن کو خوش کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۵۰۔

س ک ت

سَکَتَ یَسْکُتُ (ن) سَکْتًا :تھم جانا' ساکت ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۵۴۔

ترکیب

(آیت ۱۴۸) ''وَاتَّخَذَ'' کا فاعل ''قَوْمُ مُوْسٰی'' ہے۔ اس کا مفعول ''عِجْلًا'' ہے۔ جبکہ ''جَسَدًا'' بدل ہے ''عِجْلًا'' کا۔ ''خُوَارٌ'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے' اس کی خبر محذوف ہے اور ''لَہٗ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت ۱۵۰) جب منادیٰ کے طور پر آتا ہے تو ''اِبْنَ اُمَّ'' ایک لفظ کے طور پر آتا ہے۔ اس لیے ''اُمَّ'' پر بھی نصب آئی ہے۔ اس کا مضاف الیہ یائے متکلم ہے جو گری ہوئی ہے۔

ترجمہ:

وَاتَّخَذَ :اور بنایا
مِنْۢ بَعْدِهٖ :ان کے بعد
عِجْلًا :ایک بچھڑا
لَّهٗ :اس کے لیے
اَلَمْ يَرَوْا : کیا انہوں نے دیکھا ہی نہیں
لَا يُكَلِّمُهُمْ : کلام نہیں کرتا ان سے
سَبِيْلًا : کسی راستے کی
وَكَانُوْا :اور وہ لوگ تھے
وَلَمَّا :اور جب
وَرَاَوْا :اور انہوں نے دیکھا
قَدْ ضَلُّوْا : گمراہ ہو گئے ہیں
لَئِنْ :یقیناً اگر
رَبُّنَا :ہمارے رب نے
لَنَكُوْنَنَّ :تو ہم لازماً ہو جائیں گے
وَلَمَّا :اور جب
مُوْسٰٓى :موسیٰؑ
غَضْبَانَ :غضبناک ہوتے ہوئے
قَالَ :تو انہوںؑ نے کہا
خَلَفْتُمُوْنِيْ :تم لوگوں نے جانشینی کی میری
اَ : کیا
اَمْرَ رَبِّكُمْ :اپنے رب کے حکم سے (پہلے)
الْاَلْوَاحَ :تختیوں کو
بِرَاْسِ اَخِيْهِ :اپنے بھائی کے سر کو
اِلَيْهِ :اپنی طرف
ابْنَ اُمَّ :اے میری ماں کے بیٹے
اسْتَضْعَفُوْنِيْ : کمزور سمجھا مجھ کو
يَقْتُلُوْنَنِيْ :قتل کرتے مجھ کو

قَوْمُ مُوْسٰى :موسیٰؑ کی قوم نے
مِنْ حُلِيِّهِمْ :اپنے زیورات سے
جَسَدًا : جو ایک ڈھانچا تھا
خُوَارٌ : گائے کی ایک آواز تھی
اَنَّهٗ : کہ وہ
وَلَا يَهْدِيْهِمْ :اور نہ ہی وہ ہدایت دیتا ہے ان کو
اِتَّخَذُوْهُ :انہوں نے بنایا اس کو (الٰہ)
ظٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والے
سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ :وہ لوگ پچھتائے
اَنَّهُمْ : کہ وہ
قَالُوْا :تو انہوں نے کہا
لَّمْ يَرْحَمْنَا :رحم نہ کیا ہم پر
وَيَغْفِرْ لَنَا :اور نہ بخشا ہم کو
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ:خسارہ پانے والوں میں سے
رَجَعَ :لوٹے
اِلٰى قَوْمِهٖ :اپنی قوم کی طرف
اَسِفًا :غمگین ہوتے ہوئے
بِئْسَمَا : کتنی بری ہے وہ، جو
مِنْۢ بَعْدِيْ :میرے بعد
عَجِلْتُمْ : جلد بازی کی تم لوگوں نے
وَاَلْقَى :اور انہوںؑ نے ڈالا
وَاَخَذَ :اور پکڑا
يَجُرُّهٗٓ : کھینچتے ہوئے اس کو
قَالَ :(ہارونؑ نے) کہا
اِنَّ الْقَوْمَ : بے شک قوم نے
وَكَادُوْا :اور قریب تھا کہ وہ لوگ
فَلَا تُشْمِتْ :پس تو خوش مت کر

بِیَ : مجھ سے
وَلَا تَجْعَلْنِیْ : اور تو مت بنا مجھ کو
قَالَ : (موسیٰؑ نے) کہا
اغْفِرْ لِیْ : تو بخش دے مجھ کو
وَاَدْخِلْنَا : اور تو داخل کر ہم دونوں کو
وَاَنْتَ : اور تُو
اِنَّ : بے شک
اتَّخَذُوا : بنایا
سَیَنَالُھُمْ : ان کو پہنچے گا
مِّنْ رَّبِّھِمْ : ان کے رب (کی طرف) سے
فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا : دنیا کی زندگی میں
نَجْزِی : ہم بدلہ دیتے ہیں
وَالَّذِیْنَ : اور جنہوں نے
السَّیِّاٰتِ : برائیوں کے
تَابُوْا : انہوں نے توبہ کی
وَاٰمَنُوْٓا : اور ایمان لائے
رَبَّكَ : آپؐ کا رب
لَغَفُوْرٌ : یقیناً بے انتہا بخشنے والا ہے
وَلَمَّا : اور جب
عَنْ مُّوْسَی : موسیٰؑ سے
اَخَذَ : تو انہوںؑ نے پکڑا
وَفِیْ نُسْخَتِھَا : اور ان کی تحریر میں
وَّرَحْمَۃٌ : اور رحمت تھی
ھُمْ لِرَبِّھِمْ : اپنے رب سے ہی

الْاَعْدَآءَ : دشمنوں کو
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ : ظلم کرنے والے لوگوں کے ساتھ
رَبِّ : اے میرے رب
وَلِاَخِیْ : اور میرے بھائی کو
فِیْ رَحْمَتِكَ : اپنی رحمت میں
اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ : رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے
الَّذِیْنَ : جن لوگوں نے
الْعِجْلَ : بچھڑے کو (الٰہ)
غَضَبٌ : ایک غضب
وَذِلَّۃٌ : اور کچھ ذلت
وَکَذٰلِكَ : اور اس طرح
الْمُفْتَرِیْنَ : گھڑنے والوں کو
عَمِلُوْا : عمل کیے
ثُمَّ : پھر
مِنْ بَعْدِھَا : ان کے بعد
اِنَّ : تو بے شک
مِنْ بَعْدِھَا : اس کے بعد (یعنی باوجود)
رَّحِیْمٌ : ہر حال میں رحم کرنے والا ہے
سَکَتَ : تھم گیا
الْغَضَبُ : غصہ
الْاَلْوَاحَ : تختیوں کو
ھُدًی : ہدایت تھی
لِّلَّذِیْنَ : ان کے لیے جو
یَرْھَبُوْنَ : ڈرتے ہیں

نوٹ: آیت ۱۵۰ میں ایک بہت بڑے الزام سے حضرت ہارون علیہ السلام کو بَری کیا گیا ہے جو یہودیوں نے ان پر لگایا ہے۔ بائبل میں ہے کہ بنی اسرائیل کی فرمائش پر حضرت ہارونؑ نے سونے کا ایک بچھڑا بنا کر دیا اور اس کے

لیے قربان گاہ بنائی (خروج۔ باب ۳۲۔ آیت ۱۔ ۶)

یہ عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل جن کو اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں' ان میں سے کسی کی بھی سیرت کو انہوں نے داغدار کیے بغیر نہیں چھوڑا' اور الزام بھی ایسے سخت لگائے جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قوم جب اخلاقی پستیوں میں گری اور ان کے علماء و مشائخ بھی ان میں ملوث ہوئے' تو انہوں نے ان تمام جرائم کو انبیاءؑ کی طرف منسوب کر ڈالا جن کا وہ خود ارتکاب کرتے تھے' تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو پھر کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے' انہوں نے بھی اپنے دیوتاؤں اور اوتاروں کی زندگیاں بداخلاقی کے افسانوں سے سیاہ کی ہوئی ہیں تاکہ پنڈتوں اور پروہتوں کی اخلاقی پستیوں کا جواز رہے۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ
اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا
مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ
لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي
التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ
وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ع

ترکیب

(آیت ۱۵۵) ''اِخْتَارَ'' کا مفعول ''قَوْمَهٗ'' ہے' جبکہ ''سَبْعِيْنَ رَجُلًا'' اس کا بدل البعض ہے۔
(آیت ۱۵۷) ''اَلنَّبِيَّ'' اور ''اَلْاُمِّيَّ'' یہ دونوں ''اَلرَّسُوْلَ'' کی صفت ہیں لیکن ترجمہ بدل کے طور پر بہتر ہوگا۔

ترجمہ:

وَاخْتَارَ : اور چُنے
مُوْسٰى : موسیٰؑ نے
قَوْمَهٗ : اپنی قوم سے
سَبْعِيْنَ رَجُلًا : ستر مرد
لِّمِيْقَاتِنَا : ہماری مقرر کردہ جگہ کے لیے
فَلَمَّآ : پھر جب
اَخَذَتْهُمُ : پکڑا ان کو
الرَّجْفَةُ : زلزلے نے
قَالَ : تو (موسیٰؑ نے) کہا
رَبِّ : اے میرے رب

لَوْ شِئْتَ : اگر تو چاہتا تو
مِّنْ قَبْلُ : اس سے پہلے
اَ : کیا
بِمَا : بسبب اس کے جو
السُّفَهَآءُ : بے وقوفوں نے
اِنْ : نہیں ہے
اِلَّا : مگر
تُضِلُّ : تو بھٹکاتا ہے
مَنْ : اس کو، جس کو
وَتَهْدِیْ : اور تو ہدایت دیتا ہے (اس سے)
تَشَآءُ : تو چاہتا ہے
وَلِیُّنَا : ہمارا کارساز ہے
وَارْحَمْنَا : اور تو رحم کر ہم پر
خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ : بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے
لَنَا : ہمارے لیے
حَسَنَةً : بھلائی
اِنَّا هُدْنَآ : بے شک ہم نے رجوع کیا
قَالَ : (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا
اُصِیْبُ : میں پہنچاتا ہوں
مَنْ : جس پر
وَرَحْمَتِیْ : اور میری رحمت
كُلَّ شَیْءٍ : ہر چیز پر
لِلَّذِیْنَ : ان کے لیے جو
وَیُؤْتُوْنَ : اور پہنچاتے ہیں
وَالَّذِیْنَ : اور وہ، جو
یُؤْمِنُوْنَ : ایمان لاتے ہیں
یَتَّبِعُوْنَ : پیروی کرتے ہیں

اَهْلَكْتَهُمْ : تو ہلاک کر دیتا ان کو
وَاِیَّایَ : اور مجھ کو بھی
تُهْلِكُنَا : تو ہلاک کرتا ہے ہم کو
فَعَلَ : کیا
مِنَّا : ہم میں سے
هِیَ : یہ
فِتْنَتُكَ : تیری آزمائش
بِهَا : اس سے
تَشَآءَ : تو چاہتا ہے
مَنْ : اس کو، جس کو
اَنْتَ : تو
فَاغْفِرْ لَنَا : پس تو بخش دے ہم کو
وَاَنْتَ : اور تو
وَاكْتُبْ : اور تو لکھ دے
فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا : اس دنیا میں
وَّفِی الْاٰخِرَةِ : اور آخرت میں (بھی)
اِلَیْكَ : تیری طرف
عَذَابِیْٓ : میرا عذاب
بِهٖ : اس کے ساتھ
اَشَآءُ : میں چاہتا ہوں
وَسِعَتْ : وہ وسیع ہوئی
فَسَاَكْتُبُهَا : پس میں لکھوں گا اس کو
یَتَّقُوْنَ : تقویٰ (اختیار) کرتے ہیں
الزَّكٰوةَ : زکوٰۃ کو
هُمْ بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں پر ہی
اَلَّذِیْنَ : وہ لوگ جو
الرَّسُوْلَ : ان رسولؐ کی

النَّبِیَّ : جو نبی ہیں
الَّذِیْ : وہ
مَکْتُوْبًا : لکھا ہوا
فِی التَّوْرٰىةِ : تورات میں
یَاْمُرُهُمْ : وہ حکم دیتے ہیں ان کو
وَیَنْهٰىهُمْ : اور منع کرتے ہیں' ان کو
وَیُحِلُّ : اور وہ حلال کرتے ہیں
الطَّیِّبٰتِ : پاکیزہ (چیزوں) کو
عَلَیْهِمُ : ان پر
وَیَضَعُ : اور اتارتے ہیں
اِصْرَهُمْ : ان کے بوجھ کو
الَّتِیْ : جو کہ
عَلَیْهِمْ : ان پر
اٰمَنُوْا : ایمان لائے
وَعَزَّرُوْهُ : اور تقویت دی انؐ کو
وَاتَّبَعُوا : اور پیروی کی
الَّذِیْٓ : جو کہ
مَعَهٗٓ : انؐ کے ساتھ

الْاُمِّیَّ : امّی ہیں
یَجِدُوْنَهٗ : یہ لوگ پاتے ہیں جن کو
عِنْدَهُمْ : اپنے پاس
وَالْاِنْجِیْلِ : اور انجیل میں
بِالْمَعْرُوْفِ : نیکی کا
عَنِ الْمُنْكَرِ : برائی سے
لَهُمُ : ان کے لیے
وَیُحَرِّمُ : اور حرام کرتے ہیں
الْخَبٰٓئِثَ : ناپاک (چیزوں) کو
عَنْهُمْ : ان سے
وَالْاَغْلٰلَ : اور ان طوقوں کو
كَانَتْ : تھے
فَالَّذِیْنَ : پس جو لوگ
بِهٖ : انؐ پر
وَنَصَرُوْهُ : اور مدد کی انؐ کی
النُّوْرَ : اس نور کی
اُنْزِلَ : اتارا گیا
اُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ : ہی مراد پانے والے ہیں

نوٹ : آیت ۱۵۷ میں فلاح پانے کے لیے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں۔ اول رسول اللہ ﷺ پر ایمان' دوم آپؐ کی تکریم' سوم آپؐ کی امداد' چہارم قرآن کریم کی اتباع۔ زمانۂ نبوت میں تو یہ تائید و نصرت آپؐ کی ذات کے متعلق تھی اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے دین کی تائید و نصرت ہی رسول اللہ ﷺ کی تائید و نصرت ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ آیت کے شروع میں اَلنَّبِیَّ الْاُمِّیَّ کی اتباع کا ذکر ہے اور آیت کے آخر میں اس نور کی اتباع کا ذکر ہے جو آپؐ کے ساتھ اتارا گیا یعنی قرآن مجید۔ اس سے ثابت ہوا کہ نجاتِ آخرت قرآن و سنت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۵۸ تا ۱۶۲

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ
وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ
اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ
مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا
رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ
الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطِيْۗـــٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ
لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع

ب ج س

بَجَسَ يَبْجُسُ (ن) وَبَجَسَ يَبْجِسُ (ض) بَجْسًا : زخم چیرنا' کسی تنگ جگہ سے پانی جاری کرنا۔
اِنْبَجَسَ يَنْبَجِسُ (انفعال) اِنْبِجَاسًا: کسی تنگ جگہ سے پانی جاری ہونا' پھوٹ بہنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۶۰۔

ترکیب

(آیت ۱۶۰) ''قَطَّعْنَا'' کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے ''اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ'' حالتِ نصب میں آیا ہے۔ ''اَسْبَاطًا'' اور ''اُمَمًا'' اس کے معدود یعنی تمیز نہیں ہو سکتے' کیونکہ یہ جمع کے الفاظ ہیں۔ اس لیے ''اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ'' کا معدود محذوف ہے جو کہ ''قَبِيْلَةً'' ہوسکتا ہے' جبکہ ''اَسْبَاطًا'' اور ''اُمَمًا'' حال ہیں۔ (آیت ۱۶۰) ''اِنْبَجَسَتْ'' کا فاعل ہونے کی وجہ سے ''اِثْنَتَا عَشْرَةَ'' حالتِ رفع میں ہے اور ''عَيْنًا'' اس کا معدود یعنی تمیز ہے۔ (آیت ۱۶۱) ''زَادَ يَزِيْدُ'' کی عموماً ایک تمیز آتی ہے۔ یہاں ''سَنَزِيْدُ'' کی تمیز محذوف ہے اور ''اَلْمُحْسِنِيْنَ'' اس کا مفعول ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہیے
اِنِّيْ : بے شک میں
اِلَيْكُمْ : تم لوگوں کی طرف
الَّذِيْ لَهٗ : اُس (اللہ) کا جس کی
لَآ اِلٰهَ : کوئی اِلٰہ نہیں ہے
هُوَ : وہی
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ : اے لوگو
رَسُوْلُ اللّٰهِ : اللہ کا رسول ہوں
جَمِيْعَا : سب کی طرف
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : زمین اور آسمانوں کی حکومت ہے
اِلَّا : مگر
يُحْيٖ : وہ زندگی دیتا ہے

وَيُمِيْتُ :اور وہ (ہی) موت دیتا ہے
بِاللّٰهِ :اللہ پر
النَّبِيِّ :جو نبی ہیں
الَّذِيْ :جو
بِاللّٰهِ :اللہ پر
وَاتَّبِعُوْهُ :اور تم لوگ پیروی کرو انؑ کی
تَهْتَدُوْنَ :ہدایت پاؤ
اُمَّةٌ :ایک ایسا گروہ ہے
بِالْحَقِّ :حق کے ساتھ
يَعْدِلُوْنَ :عدل کرتا ہے
اثْنَتَيْ عَشْرَةَ :بارہ (قبیلوں) میں
اُمَمًا :گروہ در گروہ ہوتے ہوئے
اِلٰى مُوْسٰٓى :موسیٰؑ کی طرف
اسْتَسْقٰهُ :پانی مانگا انؑ سے
اَنِ :کہ
بِّعَصَاكَ :اپنی لاٹھی سے
فَانْۢبَجَسَتْ :تو پھوٹ بہے
اثْنَتَا عَشْرَةَ :بارہ
قَدْ عَلِمَ :جان لیا
مَّشْرَبَهُمْ :اپنے پینے کی جگہ کو
عَلَيْهِمُ :ان پر
وَاَنْزَلْنَا :اور ہم نے اتارا
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى :مَن وسلویٰ
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا :اس کی پاکیزہ (چیزوں) میں سے جو
وَمَا ظَلَمُوْنَا :اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ :وہ لوگ ظلم کرتے تھے اپنے آپ پر

فَاٰمِنُوْا :پس تم لوگ ایمان لاؤ
وَرَسُوْلِهِ :اور اُس کے رسول پر
الْاُمِّيِّ :اُمی ہیں
يُؤْمِنُ :ایمان رکھتے ہیں
وَكَلِمٰتِهٖ :اور اس کے فرمانوں پر
لَعَلَّكُمْ :شاید کہ تم لوگ
وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى :اور موسیٰ کی قوم میں سے
يَّهْدُوْنَ :جو ہدایت دیتا ہے
وَبِهٖ :اور اس کے ساتھ
وَقَطَّعْنٰهُمُ :اور ہم نے تقسیم کیا ان کو
اَسْبَاطًا :نسلیں ہوتے ہوئے
وَاَوْحَيْنَآ :اور ہم نے وحی کیا
اِذِ :جب
قَوْمُهٗٓ :انؑ کی قوم نے
اضْرِبْ :آپؑ ماریے
الْحَجَرَ :اس پتھر کو
مِنْهُ :اس سے
عَيْنًا :چشمے
كُلُّ اُنَاسٍ :سب لوگوں (یعنی قبیلہ) نے
وَظَلَّلْنَا :اور ہم نے سایہ کیا
الْغَمَامَ :بادل کا
عَلَيْهِمُ :ان پر
كُلُوْا :کھاؤ
رَزَقْنٰكُمْ :ہم نے عطا کیا تم کو
وَلٰكِنْ :اور لیکن (یعنی بلکہ)
وَاِذْ :اور جب

قِيْلَ : کہا گیا
اسْكُنُوْا : تم لوگ سکونت اختیار کرو
وَكُلُوْا : اور کھاؤ
حَيْثُ : جہاں سے
وَقُوْلُوْا : اور کہو
وَّادْخُلُوا : اور داخل ہو
سُجَّدًا : سجدہ کرنے والوں کی حالت میں
لَكُمْ : تمہارے لیے
سَنَزِيْدُ : ہم زیادہ کریں گے (بلحاظ درجہ)
فَبَدَّلَ : تو بدل دیا
ظَلَمُوْا : ظلم کیا
قَوْلًا : بات کو
قِيْلَ : کہا گیا
فَاَرْسَلْنَا : پھر ہم نے بھیجا
رِجْزًا : ایک عذاب
بِمَا : بسبب اس کے جو

لَهُمْ : ان سے
هٰذِهِ الْقَرْيَةَ : اس بستی میں
مِنْهَا : اس میں
شِئْتُمْ : تم لوگ چاہو
حِطَّةٌ : معافی ہو
الْبَابَ : دروازے میں
نَّغْفِرْ : تو ہم بخش دیں گے
خَطِيْٓئٰتِكُمْ : تمہاری خطاؤں کو
الْمُحْسِنِيْنَ : بلاکم وکاست کام کرنے والوں کو
الَّذِيْنَ : ان لوگوں نے جنہوں نے
مِنْهُمْ : ان میں سے
غَيْرَ الَّذِيْ : اس کے علاوہ جو
لَهُمْ : ان سے
عَلَيْهِمْ : ان پر
مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ : وہ ظلم کرتے تھے

نوٹ: آیت ۱۵۸ اس بات کی دلیل ہے کہ نبوت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہوگئی اور آپؐ قیامت تک ساری دنیا کے پیغمبر ہیں۔ غزوۂ تبوک میں آپؐ تہجد کی نماز کے لیے اٹھے تو کچھ صحابہ کرامؓ آپؐ کی حفاظت کرنے لگے۔ نماز کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں خصوصیت کے ساتھ مجھے دی گئی ہیں، مجھ سے پہلے یہ رعایتیں کسی دوسرے پیغمبر کو نہیں دی گئیں: (۱) میں دنیا جہان کے لوگوں کی طرف پیغمبر بن کر آیا ہوں۔ اس سے پہلے ہر رسول صرف اپنی قوم کی طرف ہی رسول ہو کر آتا رہا ہے۔ (۲) مجھے صرف رعب سے ہی دشمن پر نصرت حاصل ہو جاتی ہے۔ (۳) مالِ غنیمت میرے اور میری اُمت کے لیے حلال کر دیا گیا۔ مجھ سے پہلے مالِ غنیمت کھانا گناہ کبیرہ تھا۔ (۴) ساری زمین میرے لیے پاک ہے اور مسجد ہے۔ جہاں کہیں نماز کا وقت آیا اسی مٹی سے مسح یعنی تیمّم کیا اور اسی مٹی پر نماز پڑھ لی۔ مجھ سے پہلے لوگ صرف اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کرتے تھے۔ (۵) مجھ سے کہا گیا کہ ایک درخواست کی اجازت ہے، مانگ لو۔ میں نے اپنا سوال یوم قیامت پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ تمہارے لیے ہے اور قائل توحید کے لیے ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی یہودی یا نصرانی نے میری امت سے میرے آنے کی خبر سن لی مگر مجھ پر ایمان نہیں لایا تو وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ (ابن کثیر)

معرفتِ حدیث کے بنیادی علوم

ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی ☆

حدیث کی معرفت کے لیے سند و متن دونوں کی تحقیق ضروری ہوتی ہے۔ محدّثین نے سند و رجال کی تحقیق کے لیے فن اسماء رجال، علم جرح و تعدیل، نقد متن کے لیے علم درایت اور اس جیسے دیگر علوم و فنون ایجاد کیے۔ نقد متن، تحقیق سند کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور مشکل کام ہے۔ محدثین نے اپنی بہترین کوششوں سے اس فن میں کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جس میں بعد والوں کے لیے کسی کام کی گنجائش ہو۔ زیر نظر مضمون میں معرفتِ حدیث کے ان بنیادی علوم کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے جن کے بغیر بعض اوقات حدیث کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(۱) علم مختلف الحدیث

علم مختلف الحدیث ان قواعد و ضوابط کا نام ہے جن کی مدد سے ایسی دو حدیثوں کے درمیان تطبیق یا ترجیح قائم کی جاتی ہے جو معنی اور مفہوم میں متعارض ہوں۔ جیسے یہ حدیث ((لَاعَدْوٰی وَلَا طِیَرَۃ))(۱) ''کوئی مرض متعدی نہیں ہوتا اور نہ کوئی فال/شگون اچھا یا برا ہوتا ہے'' اور حدیث ((فِرَّ مِنَ الْمَجْزُوْمِ کَمَا تَفِرُّ مِنَ الْاَسَدِ))(۲) ''مجزوم (یعنی جسے کوڑھ کا مرض ہو اُس) سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو'' دونوں حدیثیں باہم متعارض ہیں۔ اس طرح کی ذخیرۂ حدیث میں اور بھی مثالیں ہیں جہاں دو حدیثوں کا مفہوم آپس میں متعارض ہوتا ہے اور ان میں کوئی ایک مفہوم متعین کرنا ہوتا ہے۔ فن حدیث میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جو مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی کتاب امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کی ہے جو 'اختلاف الحدیث' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں امام نے بہت سی متعارض حدیثوں کے درمیان جمع و تطبیق یا ترجیح کا عمل انجام دیا ہے۔ گوکہ اس میں آپ نے استیعاب کا قصد نہیں کیا' تاہم اس کام کے تجربہ اور ضمن میں اس فن کے کچھ ایسے اصول سامنے آئے جن کی مدد سے معارض نصوص میں تطبیق یا ترجیح کا عمل انجام دینے کی راہ بڑی حد تک ہموار ہوگئی۔

اس کے بعد ابن قُتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) نے اس موضوع پر اپنی مشہور زمانہ کتاب 'تاویل مختلف الحدیث' تصنیف فرمائی جس میں خاص طور پر ان اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی جن کا تعلق ایمانیات یا اخلاقیات سے ہے۔ (احکام سے متعلق متعارض نصوص کو بہت کم موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔)

اس کے بعد امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ مصری' طحاوی (م ۳۲۱ھ) نے 'مختلف الحدیث' کی تالیف

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ دینیات' مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ

فرمائی۔ احادیث احکام کے تعلق سے ان کی کتاب 'شرح معانی الآثار' لاجواب تصنیف ہے اور اس سے بھی بڑی ان کی کتاب 'بیان مشکل الآثار' ہے جو جمیع ابواب دین سے متعلق ممکنہ حد تک تمام ہی مشکل یا متعارض احادیث کی تشریح اور تاویل کے سلسلہ میں ایک موسوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے علاوہ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی 'تہذیب الآثار' جو زمانہ کے دستبرد کی نذر ہوگئی لیکن اس کی دو یا تین جلدیں جو محفوظ رہ گئیں تھیں وہ طبع ہو چکی ہیں۔

رفع تعارض کا طریقہ:

(۱) نسخ: اگر دو یا دو سے زائد حدیثوں میں بظاہر تعارض ہو تو اس تعارض کو دور کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ خود رسول اللہ ﷺ سے ان میں سے کسی ایک کے منسوخ ہونے کی صراحت کسی حدیث میں تو وارد نہیں۔ اگر کسی حدیث مرفوع میں نسخ کی صراحت ہو تو یہ نسخ منصوص ہے اور باتفاق علماء مقدم ہے۔ چنانچہ ناسخ پر عمل کیا جائے گا اور منسوخ حدیث کو چھوڑ دیا جائے گا۔

(۲) ترجیح: اگر نسخ منصوص کا وجود نہیں تو ترجیح کا عمل اختیار کیا جائے گا۔ یعنی وجوہ ترجیح کی بنیاد پر ایک حدیث کو دوسری پر راجح قرار دیا جائے گا۔

(۳) جمع و تطبیق: اگر ترجیح ممکن نہ ہو تو ممکنہ حد تک دونوں میں جمع و تطبیق کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) توقف: اگر دونوں حدیثوں میں تطبیق ممکن نہ ہو تو دونوں حدیثوں کے سلسلے میں توقف اختیار کیا جائے گا۔

ترجیحی عمل کی تشریح: ترجیحی عمل کا مطلب اخبار و آحاد کا دیگر ادلہ شرعیہ سے موازنہ کرنا ہے' جس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) عرض الحدیث علی القرآن (حدیث کا قرآن کریم سے موازنہ)

(۲) عرض الحدیث علی السُّنّة المشهورة (حدیث کا سنت مشہورہ سے موازنہ)

(۳) عرض الحدیث علی الاجماع (حدیث کا اجماعِ امت سے تقابل)

(۴) عرض الحدیث علی الاحادیث الثابة فی الباب (حدیث کا ان دیگر احادیث سے موازنہ جو باب میں وارد ہیں)

(۵) عرض الحدیث علی عمل المتوارث فی الامة (حدیث کا امت کے اس موروثی تعامل سے موازنہ جو نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے)

(۶) عرض الحدیث علی القواعد الکلیة الثابة فی الشرع (حدیث کا شریعت کے ان مسلمہ اصولوں سے موازنہ جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں)

(۷) عرض خبر الواحد علی ما تعم به البلویٰ وغیرہ (یہ دیکھنا کہ حدیث' جو فرد واحد کی خبر ہے' کہیں ایسے مسئلہ سے متعلق تو نہیں جو تمام لوگوں کی عمومی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا علم کثیر لوگوں کو

ہونا چاہیے۔ ایسے مسئلے میں شخص واحد کا روایت کرنا یہ گمان پیدا کرتا ہے کہ کہیں یہ حدیث کسی باطنی علت کا شکار تو نہیں)

حدیث کا قرآن سے موازنہ: اس میں شک نہیں کہ اصل کتابِ ہدایت قرآن کریم ہے اور احادیث نبوی اس کی شرح و بیان کا درجہ رکھتی ہیں' اور جیسا کہ معلوم ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ و معنیٰ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل ہیں' جب کہ حدیث نبوی کے معنیٰ تو اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں اور عام طور پر ان کی روایت بالمعنیٰ ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ قرآن کریم اور اسی کی شرح ''حدیث'' جو منجانب اللہ ہے' دونوں آپس میں متناقض و متعارض ہوں۔ پس اگر کسی حدیث کا مفہوم قرآن کے معنیٰ سے معارض ہوتا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ اس حدیث کی روایت میں کوئی خلل اور نقص ہے' یعنی جو کلام آپ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ آپ کا نہیں بلکہ راوی کی جانب سے کسی خطا و نسیان یا پوری بات نقل نہ کرنے یا اصل مراد نبوی کو نہ سمجھ کر اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا نتیجہ ہے۔ جب کہ قرآن کریم اس طرح کے تمام احتمالات سے منزہ ہے۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین متعدد احادیث کو قرآن کریم سے موازنہ کر کے ان کی صحت اور خطا کا فیصلہ کرتے تھے۔ مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی اولاد جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ (۳) یہ روایت جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سنی تو فرمایا: حَسْبُكُمُ الْقُرْآن ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (۴) ''تمہیں قرآن کافی ہے' جس کے رو سے کوئی کسی کا دوسرے بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

یا یہ روایت کہ دنیا کی مدت سات ہزار برس ہے' اس کے بعد دنیا ختم ہو جائے گی۔ (۵) یہ روایت قرآنی آیت ﴿قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۶) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے'' کے خلاف ہے۔

لہٰذا ایسی حدیث جو قرآنی صراحت یا اس کے عمومات و ظواہر کے خلاف ہو اسے راوی کا وہم سمجھا جائے گا۔

حدیث کا سنتِ مشہورہ سے موازنہ: حدیث کا سنتِ مشہورہ سے موازنہ کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جو سنت بطریقِ تواتر یا بطریقِ شہرت لوگوں میں جانی پہچانی جاتی ہے اور لوگوں کا اس کے مطابق عمل بھی ہے' حدیث اگر اس مشہور سنت کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہ جزئی کسی خاص شخص یا وقت یا حال کے اعتبار سے کوئی استثنائی صورت تھی۔ مثلاً تنہا حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہادت کو دو کے قائم مقام کرنا' یا جیسے یہ روایت: ((قضٰی رسول اللّٰہ ﷺ بیمین و شاھد)) (۶) ''رسول اللہ ﷺ نے ایک یمین اور ایک شاہد کی بنیاد پر فیصلہ فرمایا'' جو سنت مشہورہ کے خلاف ہے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ سے منقول فیصلے' اسی طرح خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے منقول فیصلوں میں قدرِ مشترک یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کم از کم دو گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کیا جائے' لہٰذا یہ حدیث اس پر محمول ہوگی کہ خصمین کے درمیان بطورِ مصالحت آپ ﷺ نے ایسا کیا ہے نہ کہ بطورِ قضا۔ بصورت دیگر یہ حدیث قرآنی آیات: ﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (۸) ''اور گواہی

دیں دو گواہ مَردوں میں سے'' اور ﴿وَاَشْهِدُوا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۹) ''اور گواہی دیں تم میں سے دو عادل لوگ'' کے خلاف واقع ہوگی۔

یا یہ سمجھا جائے گا کہ وہ حدیث منسوخ ہے یا مؤول ہے یا غیر ثابت۔ مثلاً حدیث ''اگر جنابت کی حالت میں کسی نے صبح کی تو وہ اس دن روزہ نہ رکھے'' (۱۰) اگرچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن جمہور نے اس حدیث کو سنت مشہورہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ اور امّ المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کثیر طرق سے اس مضمون کی حدیثیں مروی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں صبح فرماتے تھے اور پھر غسل فرما کر نماز فجر پڑھانے کے لیے برآمد ہوتے تھے اور اس دن کا روزہ بھی رکھتے تھے۔ امام ترمذی نے روایت نقل کی:

اخبرتنی عائشة و ام سلمة زوجا النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یدرکه الفجر وهو جنب من اهله، ثم یغتسل ویصوم، قال ابوعیسٰی حدیث عائشة وام سلمة حدیث حسن صحیح والعمل علٰی هذا عند اکثر اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرهم وهو قول سفیان والشافعی واحمد واسحٰق (۱۱)

''امہات المومنین حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (بعض مرتبہ) جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے' پھر غسل فرما کر روزہ رکھتے تھے۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ اور اُمِّ سلمہؓ کی حدیث حسن اور صحیح ہے اور اسی پر اصحابِ رسول اور ان کے علاوہ اکثر اہل علم کا عمل بھی ہے اور یہی رائے ائمہ میں سفیان (ثوری)' شافعی' احمد بن حنبل اور اسحٰق (بن راہویہ) کی بھی ہے۔''

حدیث کا اجماعِ امت سے تقابل: اگر کوئی ایسی حدیث وارد ہو جس کے خلاف امت کا اجماع ہو گیا ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث یا تو منسوخ ہے یا کسی علت کے ذریعہ معلول ہے' چنانچہ حکم شرعی کی بنا اس پر نہیں رکھی جا سکتی۔ مثلاً وہ حدیث جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چور اگر چوتھی مرتبہ چوری کرے تو اسے قتل کر دو۔ (۱۲) یہ حدیث اجماعِ اُمت کے خلاف ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرمایا کہ ''شروع میں ایسا ہی حکم تھا پھر بعد میں منسوخ ہو گیا''۔ محمد بن اسحاق نے محمد بن منکدر کے واسطہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے' فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص شراب پیے اسے کوڑے لگاؤ اور اگر چوتھی بار پیے تو اسے قتل کر دو''۔ پھر اس کے بعد ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا جس نے چوتھی مرتبہ شراب پی تھی تو آپؐ نے مناسب سزا دے کر اسے چھوڑ دیا' قتل نہیں فرمایا۔ حضرت قبیصہ بن ذویب رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مضمون منقول ہے۔ اس کے بعد امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ ''اس پر تمام اہل علم کا عمل ہے اور اس سلسلہ میں متقدمین و متاخرین میں سے کسی کا اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے۔'' (۱۳)

اسی طرح یہ روایت کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پرندے کا پکا ہوا گوشت تھا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! میرے پاس ایسے شخص کو بھیج دے جو تیری مخلوق میں سب سے زیادہ تجھ کو محبوب ہو جو میرے ساتھ اس کھانے میں

شریک ہو''۔ چنانچہ حضرت علی تشریف لائے اور آپؐ کے ساتھ تناول فرمایا۔ (۱۴)

اس حدیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اُمت میں سب سے افضل قرار دیا گیا ہے جو اجماع کے خلاف ہے' کیونکہ باجماعِ اُمت صحابہ میں افضل ترین شخصیت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس کے علاوہ محقّقین نے اس کی اسنادی حقیقت پر بھی کلام کیا ہے۔ (۱۵)

حدیث کا باب کی دوسری احادیث سے موازنہ: منقول حدیث کی صرف اسنادی حیثیت ہی سب کچھ نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ پورے ذخیرۂ حدیث پر مجموعی نظر ڈال کر اس باب سے متعلق جتنی احادیث ہوتی ہیں سب کو جمع کر کے ان میں موازنہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اصل الفاظِ نبوی تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یا ان مختلف احادیث میں منشاءِ نبوی سے قریب تر کی شناخت و تعیین کی کوشش کی جاتی ہے۔

حدیث کا عملِ متوارث سے موازنہ: تمام ائمہ کے یہاں عمل متوارث کی اہمیت ہے' چنانچہ امام مالکؒ حدیثوں کو ''عمل اہل مدینہ'' کی کسوٹی پر پرکھتے تھے اور جس حدیث کو ''عمل اہل مدینہ'' کے مطابق نہیں پاتے تھے تو اسے قابل عمل نہیں سمجھتے تھے۔ امام مالک نے ایک مرتبہ امام لیث بن سعد کو خط میں لکھا: ''لوگ اہل مدینہ کی اتباع کرتے ہیں' مدینہ کی طرف ہجرت ہوئی اور یہیں قرآن کے احکامات نازل ہوئے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے سامنے تھے اور وحی و قرآن ان کے سامنے نازل ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے تھے اور صحابہ اس پر عمل کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں سکھاتے تھے وہ اس کا اتباع کرتے تھے' یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور آپ کے بعد امت میں ایسے صاحب امر (خلفاءِ راشدین) ہوئے جن کی لوگوں نے اتباع کی۔ صحابہ کے بعد تابعین اسی مسلک پر چلے اور انہی سنتوں کی پیروی کرتے رہے' اس سے ہم نے کسی کو اختلاف کرتے نہیں پایا۔ اس لیے جس چیز پر اہل مدینہ کا اجماع ہو چکا اس کے خلاف عمل کرنا یا اس سے اختلاف کرنا میرے نزدیک جائز نہیں۔'' (۱۶)

اسی طرح محمد ابوزھو امام مالک کی شرائط اور اصولِ نقد حدیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فاشترط فی قبول خبر الواحد ان لا یعمل علی خلافه الجمهور والجم الغفیر من اهل المدینة اذ أن علمهم بمنزلة روایتهم عن رسول اللّٰه ﷺ وروایة جماعة عن جماعة اولٰی بالقبول من روایة فرد عن فرد (۱۷)

''امام مالک نے قبولیت حدیث کے لیے یہ شرط رکھی کہ اس کا متن جمہور اہل مدینہ کے عمل کے خلاف نہ ہو' اس لیے کہ اہل مدینہ کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بمنزلہ روایت کے ہے اور ایک جماعت کا دوسری جماعت سے روایت کرنا قبولیت کے اعتبار سے زیادہ اولیٰ ہے بنسبت ایک فرد کا دوسرے فرد کے روایت کرنے سے۔''

حدیثوں کے معاملہ میں امام مالک کے شیخ ربیعہ اور دوسرے ائمہ تابعین' جیسے محمد بن ابی بکر اور عمرو بن حزم کا بھی یہی عمل تھا جو مدینہ میں عہدۂ قضا پر مامور تھے۔ ان کے بہت سے فیصلے خبر واحد کے خلاف اور عمل اہل مدینہ کے مطابق ہوتے تھے۔ چنانچہ امام مالک سے منقول ہے' وہ فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن ابی بکر اور عمرو بن حزم کو دیکھا کہ وہ مدینہ کے قاضی تھے۔ ان کے بھائی عبداللہ کے پاس حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور ثقہ تھے۔ لیکن

جب کسی معاملہ میں حدیث ایک طرف اور عمل اہلِ مدینہ دوسری جانب ہوتا تو یہ دونوں حضرات عمل اہل مدینہ کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ اس پر ان کے بھائی عبداللہ ان سے کہتے کہ یہ فیصلہ حدیث کے خلاف ہے تو محمد بن ابی بکر کہتے: ہاں، لیکن اہل مدینہ کے صلحاء کا عمل اس سے قوی تر ہے۔ (۱۸)

دوسری طرف اہل کوفہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسے اجلہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے عمل کو حدیثوں کی نقد و تحقیق کی بنیاد مانتے تھے۔

اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ جن جن ملکوں اور شہروں میں گئے وہاں وہ اشاعت اسلام اور سنت نبوی کی خدمت میں مصروف رہے، لوگوں نے ان کی اقتدا و اتباع کی، لہٰذا صحابہ کرام کے ذریعے جو عمل عمومی طور پر نقل در نقل ہوتا ہوا آیا وہ کسی مضبوط اصل پر مبنی تھا، اس لیے اس کا احترام لازمی ہوگا۔ سلف میں نقد حدیث کی اصل کسوٹی عمل متوارث ہی تھا، چنانچہ دوسری صدی کے اختتام تک اہل علم عمومی طور پر اخبارِ آحاد کو سلف کے معمول پر رکھ کر اس کی صحت و سقم کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

حدیث کا شریعت کے مسلمہ اصولوں سے موازنہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہاء کرام کتاب اللہ، سنت رسول اور عمل صحابہ میں وارد مختلف احکام سے متعلق ہدایات و اشارات میں غور کر کے ایک قدر مشترک اصول مستنبط کرتے ہیں جو قوت میں سنت مشہورہ سے کم نہیں ہوتا، اگرچہ خاص اس مضمون کو ادا کرنے والی نصوص کسی مضبوط سند سے منقول نہ ہو۔ جیسے یہ روایت کہ جس کا نام محمد یا احمد ہوگا وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ (۱۹) حافظ ابن قیم نے اس طرح کی روایات کو موضوع قرار دیا۔ (۲۰) کیونکہ اصول شریعت سے یہ بات ثابت ہے کہ قیامت میں کوئی شخص رنگ و نسل، نام و لقب، جنس و ذات، قرابت و رشتہ داری، کسی پیر یا پیغمبر کی طرف نسبت وغیرہ کے ذریعہ نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ نجات کا دار و مدار ایمان و عمل صالح پر ہے۔

خبرِ واحد کا ایسے مسئلہ سے متعلق ہونا جس میں عموم بلویٰ ہو: عموم بلویٰ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حدیث کسی ایسے مضمون سے متعلق ہو جس کے شہرت اور استفاضہ کے ساتھ لوگوں میں اس کے پھیلنے کے اسباب موجود ہوں اور اس کے جاننے کی سبھی کو حاجت بھی ہو، اس کے باوجود ایک ہی شخص اس کو روایت کر رہا ہے تو یہ بات شبہ پیدا کرتی ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے حکم عام کا درجہ نہ دیا جائے۔ مثلاً بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ مسّ ذکر (آلۂ تناسل کو چھونے) سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ (۲۱) اس روایت کو مرد صحابہ میں کوئی بھی روایت نہیں کرتا جب کہ اس کا علم تمام مَردوں کو ہونا چاہیے تھا۔ لہٰذا اس اصول کی بنیاد پر یہ حدیث ترک کر دی گئی۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں دوسری حدیث بھی ہے جس میں صراحت سے یہ بات بیان کی گئی کہ مسّ ذکر سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((وَهَلْ هُوَ اِلَّا مُضْغَةٌ مِنْهُ اَوْ بِضْعَةٌ مِنْهُ)) (۲۲) ''کیا وہ جسم کا ایک حصہ نہیں!''

(۲) علم ناسخ الحدیث ومنسوخہ

معرفت حدیث کے لیے جو علوم درکار ہیں ان میں اہم علم ناسخ اور منسوخ حدیثوں کا ہے۔ جب تک اس علم میں مہارت نہیں ہوگی متعارض نصوص میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

نسخ کے لغوی معنیٰ ختم کرنا' زائل کرنا اور اصطلاحِ شریعت میں' شارع کی جانب سے حکم سابق کو ختم کر دینا ہے۔ کیونکہ شارع کی نگاہ میں کسی حکم کو دینے میں کوئی مصلحت اور غرض ہوتی ہے' جب وہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو حکم اول منسوخ کر دیا جاتا ہے —— بنیادی طور پر نسخ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نسخ منصوص (۲) نسخ اجتہادی۔

(۱) نسخ منصوص: کبھی دلیل نسخ خود مرفوع نص میں وارد ہوتی ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے فرمایا ''میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا' اب تم ان کی زیارت کر سکتے ہو۔''(۲۳)

یا دوسری مثال: ''میں نے تم کو قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے کو منع کیا تھا' اب تم جتنے دن چاہو رکھ سکتے ہو۔''(۲۴)

(۲) نسخ اجتہادی: نسخ اجتہادی یہ ہے کہ دو متعارض دلیلوں میں سے کسی ایک کا صحابی کے قول سے متاخر ہونا' یا تاریخ سے مقدم یا مؤخر ہونا' یا ممانعت سے' یا قواعد کلیہ کے ساتھ معارض ہونا معلوم ہو' یا نص متواتر یا مشہور کے ساتھ تعارض ہو' یا روایت اس صحابی کے عمل کے خلاف ہو جس سے وہ حدیث روایت کی گئی ہے۔ ذیل میں نسخ اجتہادی کی مثالیں علی ترتیب المذکور بیان کی جاتی ہیں۔

صحابی کے قول سے نسخ کا علم ہونا: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ آگ پر پکی ہوئی چیز سے وضو کرنا اور نہ کرنا دونوں رسول اللہ ﷺ کا عمل تھا' لیکن بعد والا عمل وضو نہ کرنا تھا۔

قال ابو عیسیٰ والعمل علیٰ هذا عند اکثر اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعین ومن بعدهم مثل سفیان وابن المبارك والشافعی واحمد واسحٰق رأو ترك الوضوء مما مست النار' وهذا آخر الامرین من رسول الله ﷺ وکان هذا الحدیث ناسخ للحدیث الاول حدیث الوضو مما مست النار۔(۲۵)

''امام ترمذی نے فرمایا کہ اسی پر عمل ہے اکثر اہلِ علم اور اصحابِ رسول اور تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ' مثلاً سفیان' ابن المبارک' شافعی' احمد' اسحٰق کے یہاں۔ ان کی رائے آگ پر پکی ہوئی چیزیں کھانے سے وضو نہ کرنے کی ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے دو مختلف عمل میں سے آخری عمل ہے اور یہ حدیث **الوضوء مما مست النار** کے لیے ناسخ ہے۔''

تاریخ کے ذریعہ نسخ کا علم ہونا: حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث **افطر الحاجم والمحجوم**(۲۶) ''سینگی لگانے والا اور لگوانے والا روزہ نہ رکھے'' جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''آپ ﷺ نے سنگی لگوائی حالانکہ آپؐ روزہ سے تھے۔(۲۷) سے معارض ہے۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دوسری حدیث پہلی

حدیث کے لیے ناسخ ہے کیونکہ دوسری حدیث حجۃ الوداع ۱۰ھ اور پہلی ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع کی ہے۔ (۲۶)

ممانعت کے ذریعہ نسخ کا علم: ممانعت کے ذریعہ نسخ کا مطلب یہ ہے کہ دو ایسی حدیثیں آپس میں متعارض ہوں جن میں سے ایک کسی چیز کی حرمت اور دوسری سے مباح ہونا معلوم ہوتا ہو۔ تو چونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اس لیے مبیح (حلت بیان کرنے والی) حدیث کو منسوخ اور حرمت وممانعت بیان کرنے والی حدیث کو ناسخ مانا جائے گا۔ مثلاً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے گوہ کھانے کی حلت معلوم ہوتی ہے۔ (۲۹) جب کہ عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ (۳۰) لہٰذا حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ناسخ مانا جائے گا اور حضرت خالد بن ولید کی حدیث کو منسوخ۔

شرعی قواعد کلیہ کے ذریعہ نسخ کا علم: فقہاء کرام کسی حدیث کے شرعی قواعد کلیہ سے مخالف ہونے کی بنا پر بھی اس کے منسوخ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جیسے حضرت سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کے متعلق جس نے اپنی بیوی کی باندی سے وطی کر لی تھی' یہ فیصلہ دیا کہ اگر اُس نے زبردستی کی ہے تو باندی آزاد ہوگئی اور اس پر اس کی مالکن کے لیے اس باندی کا مثل دینا واجب ہے اور اگر اس باندی کی مرضی سے اس نے یہ کام کیا تو باندی اس شخص کی ہوگئی اور مالکن کے لیے اس باندی کا مثل اس پر واجب ہے۔ (۳۱)

امام خطابی فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ فقہاء میں سے کوئی بھی اس حدیث کا قائل ہوگا کیونکہ اس میں چند چیزیں ہیں جو اصول کے خلاف ہیں:

(۱) ایجاب المثل فی الحیوان (حیوان کا ضمان مثل سے واجب ہونا۔)

(۲) استجلاب الملك بالزنا (زنا کے ذریعہ ملکیت حاصل کرنا۔)

(۳) اسقاط الحد عن البدن وایجاب العقوبة فی المال وھٰذہ کلھا امور منکرہ لا تخرج علی مذھب احد من الفقھاء وخلیق ان یکون الحدیث منسوخًا ان کان لہ اصل فی الروایة (۳۲)

(بدن پر سے حد ساقط کر کے مال میں سزا واجب کرنا۔ یہ تمام باتیں انوکھی ہیں کسی فقیہہ کے مذہب سے میل نہیں کھاتیں۔ اس لیے یہ حدیث اگر اصولِ روایت کے مطابق ثابت بھی ہو تو منسوخ کہی جانے کے زیادہ مستحق ہے۔)

صحابی کے عمل کے خلاف روایت: جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ کُتّا اگر کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کا سات مرتبہ دھونا ضروری ہے' لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کا عمل اس کے خلاف تھا۔ (۳۳)

(۳) علم غریب الحدیث

غریب الحدیث ان مشکل الفاظ کو کہتے ہیں جو کسی حدیث کے متن میں پائے جاتے ہیں' جن کے معنیٰ ومراد قلیل الاستعمال ہونے یا مختلف معنوں کا احتمال رکھنے کی وجہ سے واضح نہ ہوں۔

حدیث شریف کی معرفت کے لیے سب سے پہلے اس کے الفاظ کے لغوی معانی کا علم ہونا از حد ضروری

ہے۔ کیونکہ متن سے حکم شرعی یا مرادِ نبویؐ پہچاننا الفاظ کے لغوی معنیٰ جاننے پر موقوف ہوتا ہے۔ اسلام کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا گیا اور حدودِ عرب سے نکل کر عجم میں داخل ہونا شروع ہوا اسی وقت سے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ الفاظِ حدیث کی 'لغت عرب' اور 'مرادِ نبوی' کی حیثیت سے شرح کر دی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے امام سفیان ثوری اور امام مالک وغیرہ نے جستہ جستہ اپنے کلام میں غریب الحدیث کی وضاحت کی۔ لیکن باضابطہ طریقہ پر اس فن میں تصنیف کا سلسلہ شروع کرنے والے ابوعبیدہ معمر بن مثنی ہیں' ان کے بعد ابوعبید قاسم بن سلام (۲۲۴ھ) نے 'غریب الحدیث والآثار' اور عبداللہ بن مسلم بن قُتیبہ دینوری (۲۲۷ھ) نے ''غریب الحدیث'' لکھی۔ اسی طرح ابراہیم بن اسحٰق حربی (م ۲۸۵ھ) اور ابوسلیمان خطابی (م ۳۸۸ھ) کی ''غریب الحدیث'' بھی اس فن کی مشہور کتابیں ہیں۔

بعد کے زمانہ میں انتہائی جامع اور معتبر تصنیف 'النہایۃ فی غریب الحدیث' لکھی گئی' جس کے مصنف ابن الاثیر جزری (م ۶۰۶ھ) ہیں۔ ابن الاثیر جزری ہی نے اپنی دوسری اہم ترین کتاب 'جامع الاصول' میں حدیث کے وضاحت طلب الفاظ کی بہترین تشریحات فرمائی ہیں۔

فخر المحدثین بالہند علامہ محمد بن طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) کی 'مجمع بحار الانوار' بھی اس فن کی بے مثل کتاب ہے۔

(۴) علم فقہ الحدیث

علم فقہ الحدیث سے مراد ان احکامِ شرعیہ کی معرفت حاصل کرنا ہے جو نصوصِ حدیث میں صراحۃً یا دلالۃً یا اشارۃً پائے جاتے ہیں۔ فقہ الحدیث پر سیر حاصل گفتگو عام طور پر ان کتب میں ہوتی ہے جو حدیث کی کسی کتاب کی شرح کے طور پر تصنیف کی جاتی ہیں۔ ذیل میں کچھ ایسی شرحوں کے نام لکھے جاتے ہیں جو خاص طور پر فقہ الحدیث' مذاہب فقہاء' ان کے ادلہ' متعارض ادلہ میں بعض کے وجوہ ترجیح اور دیگر خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

(۱) الاستذکار الجامع لمذاهب فقها الامصار وعلماء الاقطار فيما تضمنه الموطأ من معانى الرأى والآثار' لابن عبد البر الاندلسى (م ۳٦۸هـ)

(۲) تهذيب الآثار لابن جرير طبرى (م ۳۱۰هـ)

(۳) المفهم فى شرح ما اشكل من تلخيص صحيح مسلم للقرطبى (م ٦۷۱هـ)

(٤) فقه السنن والآثار' معالم السنن (شرح ابى داوٗد) للخطابى (م۳۸۸هـ)

(٥) المنهاج على صحيح مسلم بن الحجاج۔ المعروف بشرح النووى (م٦۷٦هـ)

(٦) احكام الاحكام شرح عمدة الاحكام لابن دقيق العيد (م۷۰۲هـ)

(۷) فتح البارى شرح صحيح البخارى لابن حجر (م۸٥۲هـ)

(۸) عمدة القارى شرح صحيح البخارى لبدرالدين عينى (م۸٥٥هـ)

(۹) نيل الاوطار' للشوكانى (۱۲٥۰هـ)

(۱۰) بذل المجهود فی حل سنن ابی داوٗد للشیخ خلیل احمد سہارنپوری (م۱۳۴۶ھ)

(۱۱) فتح الملہم لشرح صحیح مسلم' للعلامۃ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ)

(۱۲) اوجز المسالک الی موطأ مالک للشیخ محمد زکریا (۱۴۰۲ھ)

(۱۳) اعلاء السنن للعلامۃ ظفر احمد عثمانی التھانوی (م۱۳۹۴ھ)

(۵) علم اسبابِ ورود الحدیث

حدیث کے سببِ ورود سے مراد وہ پس منظر ہے جس کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے کوئی بات ارشاد فرمائی یا حدیث کی قولی' فعلی وتقریری انواع کا تحقق ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ حدیث شریف کے صادر ہونے کا جو سبب ہوتا ہے اس کے ذریعہ مرادِ حدیث کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے' چنانچہ وہ حدیثیں جن کا سبب ہو یا کوئی پس منظر ہو جس میں وہ حدیثیں بیان کی گئیں یا کوئی ایسا موقع جس کے لیے صحابی نے وہ حدیث پیش کی' ان سب کے ذریعہ حدیث کو اس کے صحیح معنیٰ پر محمول کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر صرف لغوی معنی کے اعتبار سے مراد متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی تو مراد کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے اور خطرناک نتیجے تک بھی پہنچا سکتی ہے۔ مثلاً: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ))(۳۴) ''تم اپنے دنیاوی معاملات کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہو۔''

اس حدیث کو بعض لوگ اقتصادی' سیاسی اور معاشرتی مسائل میں اپنی مَن گھڑت اسکیموں اور طریقۂ کار کی ترویج کے لیے پیش کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دنیاوی معاملات میں رسول اللہ ﷺ نے کوئی دخل نہیں دیا' حالانکہ اگر اس حدیث کا پس منظر اور شانِ ورود معلوم ہو تو کوئی عقل مند شخص اس طرح کی بات کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں مختلف الفاظ سے یہ قصہ منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصارِ مدینہ کو نر اور مادہ درختوں میں جفتی کراتے دیکھا تو فرمایا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے ایک سال یہ عمل نہیں کیا تو پھل اچھے برآمد نہیں ہوئے' آپ ﷺ سے شکایت کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ))۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث ایک خاص محل اور پس منظر میں بطور مشورہ کہی گئی ہے جس کا تشریع وقانون سازی سے تعلق نہیں' ورنہ اقتصادیات ومعاشیات سے متعلق تمام احادیث وآیات کا معطل ہونا لازم آئے گا۔

(۶) علم مشکل الحدیث

علم مشکل الحدیث نام ہے ان قواعد وضوابط کا جن کے ذریعہ کسی ایسی حدیث کی مراد واضح کی جاسکے جو کسی وجہ سے مخفی رہ گئی ہو' بایں طور کہ اس کے ظاہری الفاظ کسی محال معنی پر دلالت کر رہے ہیں یا وہ قواعد شرعیہ یا عرفیہ کے معارض ہیں۔ اس کا مصداق وہ حدیثیں بھی ہوں گی جن کا آپس میں تعارض ہو اور وہ حدیثیں بھی ہوں گی جن کا معنی مرادی واضح نہ ہو بوجہ کسی امر عقلی یا شرعی یا عادی سے میل نہ کھانے کی وجہ سے۔

عام طور پر کسی حدیث کے مشکل ہونے کے درج ذیل اسباب ہوتے ہیں:

(۱) دو یا چند حدیثوں کے درمیان باہم تعارض۔

(۲) ظاہر حدیث کا قرآن کے ظاہر سے یا اجماع سے یا واقعہ تاریخی سے یا عقل سے تعارض۔

(۳) لفظ حدیث کے غریب اور نامانوس ہونے کی وجہ سے یا ایک سے زائد معنی میں مشترک ہونے یا مطلق ہونے کی وجہ سے یا معنیٰ لغوی اور معنیٰ مرادی کے درمیان مناسبت بعید ہونے کی وجہ سے حدیث کے معانی مخفی ہو جاتے ہیں۔

(۴) حدیث سے حکم شرعی مستنبط کرنے کے سلسلہ میں فقہاء کرام کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف کا پایا جانا۔ چنانچہ بسا اوقات دو مختلف نظریہ کے حامل فقہاء اپنے اپنے موقف کی تائید میں اسی ایک حدیث کو پیش کرتے ہیں۔ فرق صرف طریقہ استدلال کا ہوتا ہے' اس لیے اہل علم کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ حدیث فی الواقع کس موقف کی تائید کر رہی ہے۔

(۵) حدیث کے ظاہری معنی کا تحقق عقلاً یا شرعاً یا دونوں اعتبار سے محال ہونا۔

مشکل الحدیث کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں' لیکن یہاں ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے جو قرآن سے تعارض کی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح یہ چاند دیکھتے ہو اور اس کے دیکھنے میں بھیڑ اور جھگڑا نہیں کرو گے۔''(۳۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت میں مؤمنین کو اللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔ یہ حدیث معارض ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾(۳۶) ''نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں' جبکہ وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے'' سے' جس میں بظاہر رؤیتِ باری تعالیٰ کی نفی کی گئی ہے۔

حواشی و مراجع

(۱) صحیح البخاری' کتاب الطب' باب لاعدویٰ۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ مجذوم کے سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ نبی ﷺ نے مجذوم کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سلف میں ایک جماعت کی رائے مجذوم کے ساتھ کھانے کی ہے اور ان کے نزدیک امر بالاجتناب منسوخ ہے۔ لیکن اکثر ائمہ کا اتفاق ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے بلکہ دونوں حدیثوں کی جمع و تطبیق کی گئی ہے۔ یعنی اجتناب اور فرار کے حکم کو استحباب اور احتیاط پر اور ان کے ساتھ کھانا بیانِ جواز پر محمول کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے فتح الباری' کتاب الطب' باب لاعدویٰ۔

(۲) صحیح البخاری' ایضاً

(۳) اللآلی المصنوعة' ص ۴۲۳' ۲۲۔ علامہ جلال الدین سیوطی' مطبع علوی' ہند ۱۳۰۳ھ

(۴) سورة الانعام: ۱۶۴

(۵) المنار المنیف فی الصحیح والضعیف' ص ۸۰' حافظ ابن قیم' بیروت ۱۹۷۰ء

(۶) سورة الاحزاب: ۶۳ (۷) سنن ابی داؤد' کتاب القضاء' باب القضاء بالیمین والشاهد

(۸) سورة البقرہ: ۲۸۲ (۹) سورة الطلاق: ۲

(۱۰) مسند احمد، ۲/۲٤۸، مطبع بولاق، مصر، سنن ابن ماجه، ابواب ماجاء فی الصیام، باب ما جاء فی الرجل یصبح جنبا وهو یرید الصیام

(۱۱) سنن الترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی الجنب یدرکه الفجر وهو یرید الصیام

(۱۲) سنن الترمذی، ابواب الحدود، باب ماجاء من شرب الخمر فاجلدوه

(۱۳) ایضاً (۱۴) سنن الترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی بن علی طالب

(۱۵) قال الترمذی هذا حدیث غریب لا نعرفه من حدیث السدی (اسمٰعیل بن عبدالرحمن) الا من هذ الوجه (امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے، سدی کی اس روایت کو کسی دوسری سند سے ہم نہیں جانتے۔)

(۱٦) مالك حیاته و عصره و آراء ه و فقهه ـ ص ۱۲۲، ابوزهره، قاهره ۱۹٦۳ء

(۱۷) الحدیث و المحدثون، ص ۲۸۱، محمد محمد ابوزهو، مطبع مساهمه مصریه، مصر ۱۳۷۸ھ

(۱۸) مالك حیاته و عصره و آراء ه و فقهه، ص ۱۲۲

(۱۹) تذکرة الموضوعات، ص۸۹، محمد بن طاهر علی بن علی فتنی، بمبئی (انڈیا) ۱۳۷۳ھ

(۲۰) المنار المنیف، ص ٦۱

(۲۱) سنن الترمذی، ابواب الطهارة، باب الوضوء من مس الذکر

(۲۲) ایضاً، باب ترك الوضوء من مس الذکر

(۲۳) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، فصل فی الذهاب الی زیارة القبور

(۲۴) ایضاً (۲۵) سنن الترمذی، ابواب الطهارة، باب فی ترك الوضوء مما غیرت النار

(۲٦) سنن الترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی کراهیة الحجامة للصائم

(۲۷) ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء من الرخصة فی ذالك

(۲۸) ایضاً (۲۹) صحیح مسلم، کتاب الصید و الذبائح، باب اباحة الضب

(۳۰) سنن ابی داؤد، کتاب الاطعمة، باب فی اکل الضب

(۳۱) سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فی الرجل یزنی بجاریة امرائة۔ وسنن النسائی، کتاب النکاح، باب احلال الفرج

(۳۲) معالم السنن شرح سنن ابوداؤد، للامام خطابی (م۳۸۸ھ)، ۳/۳۳۱، کتاب الحدود، باب فی الرجل یزنی بجاریة امرأته

(۳۳) سنن الترمذی، ابواب الطهارة، باب ماجاء فی سور الکلب، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل ۳ مرتبہ دھونے کا تھا۔ دیکھئے فتح الملهم شرح مسلم، ازعلامه شبیر احمد عثمانی، باب و کتاب مذکوره من مسلم

(۳۴) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا دون، ماذکره ﷺ من معایش الدنیا علی سبیل الرأی

(۳۵) صحیح البخاری، کتاب مواقیت الصلوٰة، باب فضل صلاة العصر

(۳٦) سورة الانعام ۱۰۳: آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نگاہ اسے نہیں دیکھ سکتی، جب کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ (باقی صفحہ 58 پر)

دینی بیانیہ اور تفہیمِ مغرب کی ضرورت

محمد رشید ارشد

اکیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے انسان اور انسانی تہذیب کے بارے میں تمام کلاسیکی نظریات اور تصورات تقریباً ہر پہلو سے غیر مؤثر ہو کر رہ گئے۔ چیزوں پر سے نظریاتی گرفت بہت اہتمام اور زور کے ساتھ کمزور کر دی گئی۔ اس بہت بنیادی تبدیلی کے اثرات اور نتائج بھی اسی کی طرح ہمہ گیر ہیں۔ مغربِ جدید میں اسی مقصود کو سامنے رکھ کر طاقت اور علم کی یکجائی کے اتنے فعال مظاہر وجود میں آ گئے ہیں کہ باقی دنیا خود کو پہچاننے اور جاننے کے لیے بھی اور اپنے آپ کو اس نصب العین تک پہنچانے کے لیے بھی جس کا شعور انسان کی خلقت میں داخل ہے' مغرب کی غیر مشروط اور غیر محدود پیروی کرنے پر مائل ہے۔ آج انسان کی خود شعوری اور جہاں بینی کی کسی ایسی جہت کو موجود رہنے یا وجود پانے کی گویا اجازت ہی نہیں ہے جو مغربی ورلڈ ویو سے اختلاف نہیں بلکہ ایک غیر متصادم امتیاز بھی رکھتی ہو۔ شعور کی اور وجود کی ایک مطلق کنڈیشننگ کا نظام دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک غالب ہے اور اس کی باگ ڈور مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ اس یک طرفہ آفاقیت کا احساس تو شاید مذہبی حلقوں کو تھا' لیکن اس کا نتیجہ خیز ادراک مذہبی ذہن کے رسمیاتی ردِّ عمل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اُمتِ مسلمہ بالعموم اور علمائے دین بالخصوص تاریخ میں انسانیت کو پیش آنے والے اس سب سے بڑے غلبے کو نہ صرف یہ کہ اچھی طرح سمجھ نہ سکے بلکہ انہیں یہ اندازہ لگانے میں بھی بہت دیر لگی کہ مغرب کا یہ تسلط کیسے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ مذہبی ذہن ماضی میں' خصوصاً مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ میں' ایک کارگر ردّ عویٰ (anti thesis) کے طور پر کامیابی کے ساتھ برسرِ کار رہا' لیکن دورِ جدید میں دعویٰ (thesis) کی ساخت بدل جانے کی وجہ سے اسے وہ راستہ ہی نہ مل سکا جس پر چل کر وہ دعویٰ (thesis) کے ساتھ ایک متوازی کشمکش کا ماحول پیدا کرتا یا اس کے سامنے مزاحمت' یعنی کامیاب مزاحمت کی کوئی صورت نکالتا۔ اس ذہن کے روایتی کردار کے اجنبی بن جانے کی وجہ سے اس کا جوابِ دعویٰ (anti thesis) ہونا بھی یوں کہہ لیں کہ بے معنی اور بے تاثیر ہو کر رہ گیا۔ جوابِ دعویٰ (anti thesis) ایک ایسی مربوط حرکت کا نام ہوتا ہے جو مثال کے طور پر دائرہ بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ دائرہ بننے کا یہ عمل دعویٰ کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور اسے منہدم (deconstruct) کر دیتا ہے۔ جدیدیت سے بننے والی دنیا میں مذہبی ذہن میں دائرہ بننے والی حرکت تو ماند پڑ گئی' بس دائرے کا تصور اور اس تصور پر اعتماد باقی رہ گیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں مذہبی ذہن' شعور کے اندر ایک مغائرت میں مبتلا ہو گیا اور وجود کے دروبست میں بالکل ہی غیر مؤثر ہو گیا۔ مذہبی تصورات جب ذہن کا نظام ہی بدلنے پر قادر نہ رہے تو لامحالہ دنیا بھی ان کے

تصرّف سے نکل گئی۔

یہ ہے وہ پورا منظر نامہ جس کا حصہ ہوتے ہوئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس منظر میں چھوٹی بڑی تبدیلی لا سکنے والی کوئی ایک قوت بھی ہمارے مذہبی شعور کی تحویل میں کیوں نہیں ہے۔ مؤثر دینی بیانیہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ جو شعور کو بھی معنی دے اور وجود کو بھی اس کی حقیقت سے جڑا رکھے۔ ہمارے پاس فطرتِ شعور کی تائید رکھنے والی ایک چیز شروع سے مہیا تھی' کہ کسی نظریے کی غیر موجودگی میں ذہن انسانی میں علم کی تشکیل کا عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ پیشگی نظریہ ہی ذہن کو علم کا مادہ فراہم کرتا ہے اور اس مادے کی تمام تشکیل کی مسلسل نگرانی رکھتا ہے۔ مغرب نے تو شعور کو اس کی فطرت اور وجود کو اس کی حقیقت سے منقطع کر ہی رکھا ہے لیکن اس کی یہ کامیابی ایک حد تک ہماری غفلت کا بھی نتیجہ ہے۔ ہم نے ان دونوں اصول سے طولِ تاریخ میں کام لینے کی روایت کو یوں لگتا ہے کہ اچانک ہی چھوڑ دیا اور خود کو مغرب کے لیے ایک خالی گھر بنا لیا جس کے دروازے اس کے قبضے سے پہلے ہی کھلے ہوئے تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب سے پہلے تو اپنے دینی بیانیے کا دروبست اور اس کے لوازم کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور پھر اس کو عہدِ جدید کے تناظر میں رکھ کر یہ دیکھنے کی سعی کریں کہ اس کے لاتعلق اور غیر مؤثر ہونے کے واقعی اسباب کیا ہیں اور ان اسباب کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے۔

کسی تہذیب کی تشکیل کرنے اور اس کی روبہ کمال حرکت کو جاری رکھتے ہوئے اس کی حفاظت کرنے والا بیانیہ بڑی حد تک ایسی قوت پر اساس رکھتا ہے جو مدلول کو ذہنی استدلال سے ماورا حالت میں شعور اور وجود کی اجتماعی ہیئتوں میں راسخ اور نتیجہ خیز رکھتا ہے۔ قوت کا عنصر اگر غائب یا معطل ہو جائے تو کوئی تہذیب کسی دوسرے ذریعے سے خود کو موجود نہیں رکھ سکتی۔ انسان اور دنیا بلکہ خود اس کے نفس میں تعلق کی کوئی نوع ایسی نہیں ہے جو قوت سے مستغنی ہو۔ یہ قوت کوئی رومانوی تصور نہیں ہے بلکہ اس غلبے کا نام ہے جو ذہن کو اپنے موضوع پر ہونا چاہیے۔ جب کبھی تہذیب میں غالب رہنے کا ملکہ کمزور پڑ جاتا ہے تو اس کے اصول و اَقدار خود اسی پر بوجھ بن جاتے ہیں اور جبر و ناگواری کی یہ صورت خود انسان کو اپنے معتقدات اور نظریات' جنہیں ہم نے ابھی اصول و اقدار سے تعبیر کیا ہے' کے ساتھ بھی پیدا ہو جائے تو یہ ایسی ہی حالت ہوتی ہے جیسے درخت اپنے بیج سے منحرف ہونے لگے۔ انسان اپنی کسی بھی وجودی سطح پر اس اندرونی دولختی اور کشمکش کو سہار نہیں سکتا۔ مضبوط تہذیب اپنے اندر دَر آنے والی کشمکش کو ہاتھ کے ہاتھ فیصل کرتی ہے اور داخلی تصادم کو رفع کرنے کا یہ عمل ہی دراصل تہذیب کی وہ قوت ہے جسے اس کی اساسِ بقا کی حیثیت حاصل ہے۔

ذیل میں ہم دینی بیانیے کے بارے میں کچھ ابتدائی معروضات پیش کریں گے:

دینی بیانیے سے مراد ہے اسلام کی حقانیت اور اس کی آفاقیت کو موجودہ ذہن کے لیے قابل قبول اور حالاتِ حاضرہ کے لیے مؤثر بنانا۔ اسلام کی حقانیت کا مطلب ہے کہ اسے کسی علمی دلیل سے جھٹلایا نہ جا سکے اور کسی اخلاقی معیار پر اس کا انکار نہ ہو سکے۔ حقانیت کے لفظ میں یہ دعویٰ مضمر ہے کہ انسان اور دنیا کے پہلو سے

اسلام کا ہر متعلقہ امر، حتمی، ناقابلِ تغیّر اور ہر طرح کی تبدیلی کے ساتھ تطابق (relevance) اور تاثیر کا تعلق رکھنے والا ہے۔ انسانی ذہن اور دنیاوی حالات چاہے جتنا بدل جائیں اسلام کا دیا ہوا تصورِ حق اپنے علمی اور اخلاقی اطلاقات کے ساتھ مستقل مؤثر انداز سے موجود ہے اور یہ موجودگی وحدت اور ہمہ گیری کی حامل ہے۔

آفاقیت کا مطلب یہی وحدت اور ہمہ گیری ہے جو ابھی ذکر ہوئی۔ اسلام کی نسبت سے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دین حق کی وحدت کو استقلال اور پھیلاؤ کے ساتھ قائم رکھنے اور ثابت کرنے کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ حق کو اس کی یکتائی اور خلاقی کے ساتھ تمام ذہنی اور فطری مظاہر کی فعال اصل اور مستقل غایت بنانے کا سامان رکھتا ہے اور اپنے ماننے والے سے یہ لازمی تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسلام کی اس بنیادی ساخت کو ذہن اور زندگی کے بنتے اور بدلتے دائروں میں مرکز کی حیثیت دیے رکھے اور اپنے ایمان کو اس سطح پر استوار کرنے میں یقینی کامیابی حاصل کرے کہ اس کی روشنی میں تمام چیزیں متعیّن (define) ہو جائیں، یعنی حق سے مربوط رہیں۔ اس باب میں ذہن کی علمی روایت کے وارثوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایمان اور اس کے تمام غیبی و شہودی محتوی (content) کی مسلسل علمی تشکیلات کرتے رہیں، تاکہ ذہن کے مجموعی احوال اور حاصلات، حق اور خلق کے تعلق کے paradigm میں رہیں۔ اسی طرح اخلاقی روایت کے ترجمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے زمانی مزاج اور اس کے سلسلۂ مؤثرات کو دین کے اخلاقی مقاصد سے ہم آہنگ رکھیں جو انسان کے انفرادی اور اجتماعی وجود کو معیاری احوال اور حتمی مقاصد کا حضور مہیا کرتے ہیں۔

اس دین کا عالم اس دین کے علمی غلبے کا ایک ثبوت ہوتا ہے اور داعی اس کی اخلاقی برتری بلکہ ناگزیری کی دلیل ہوتا ہے۔ عالم کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ اسلام کے انکار میں استعمال ہونے والے دلائل کو ان کے پورے نظامِ استدلال سمیت اس طرح رَدّ کر سکے کہ حق کا علمی و عقلی غلبہ خود انکار کا قصد رکھنے والوں پر ثابت ہو جائے۔ دین کو ایسی دلیل بنا لینا عالم دین کا وظیفہ ہے کہ جس کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز ایک پرشور ضد سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ داعی یا مبلغ اصل میں ایمان کو مرکز حیات بناتا ہے جس طرح کہ عالم اسے مرکز شعور بناتا ہے۔ اسلام کے داعی کی ذمہ داریاں علمی سے زیادہ اخلاقی ہیں، تاہم اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دعوتِ دین میں اخلاق، برتری کے مقام پر ہے اور علم، کم تری کی جگہ پر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم ایمان کو شعور کی تربیت کا واحد ذریعہ بناتا ہے جب کہ مبلغ ایمانی شعور رکھتے ہوئے اسی کی رہنمائی میں انسانیت کی تاسیس اور تعمیر کرتا ہے، یعنی شعورِ ایمانی کو انسان کی اخلاقی تشکیل کی بنیاد بناتا ہے۔

اپنے زمانے میں مسلمات سازی کرنے والے تمام علوم کی یکجان تاثیر سے مجموعی شعور تشکیل پاتا ہے۔ اس مجموعی شعور کو اثر پذیری کی تمام جہتوں کے ساتھ ایمان سے مانوس کر دینا، یہ دین کا ایسا مطالبہ ہے جسے نظر انداز کر کے وہ دینی بیانیہ وجود میں نہیں آ سکتا جس کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے۔ اسی طرح انسان کے اخلاقی وجود کی تعمیر میں کارفرما مختلف عناصر کو ایک ایمانی وحدت اور تاثیر دیے بغیر اس بیانیے کا عملی پہلو سامنے نہیں آ سکتا۔ علمی

رخ سے یہ بیانیہ ایمانی آدرشوں (ideals) کو اپنے زمانے میں بننے والے مجموعی شعور کے لیے convincing بناتا ہے اور ادھر اخلاقی پہلو سے انہی آدرشوں کو انسان کے فطری اخلاقی وجود کے لیے لائق تسکین ٹھہراتا ہے۔ ہمیں مطلوب دینی بیانیہ ان دونوں قوسوں سے بننے والی دنیا کو بندگی کے مزاج پر رکھتا ہے اور ایمانی مقاصد کی طرف یکسو رہنے کی صلاحیت دیتا ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو دینی بیانیہ اصل میں ایک ایسے تصورِ انسان کا بیان ہے جو بندگی کی اصل پر قائم ہے۔ خلق و خالق، عبد و معبود اور محکوم و حاکم کا مسلمہ اس کا مستقل تناظر ہے جس کا علمی اثبات اور عملی تصدیق ہر صورتِ حال میں قطعیت کے ساتھ ممکن ہو۔ اس مستقل تناظر میں کائنات بھی define ہو جاتی ہے اور خدا اور کائنات کے بیچ انسان کا ایک فعال برزخ ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر انسان کی انفسی کلیت اور کائنات کا مجموعی پھیلاؤ، خواہ تجربی ہو یا غیر تجربی، کل علم اور تمام اخلاق کی متحدہ اساس بن جاتا ہے۔ یہی علم اور اخلاق کا وہ نقطہ عینیت (point of identity) ہے جو شعور کو اپنی مستقل اور عارضی فعلیت (functioning) کے ساتھ ایمانی بننے کی راہ دکھاتا ہے اور اسی سے یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ علم اور اخلاق کی ideal اکائی، خدا کو مانے بغیر تصور میں تو آسکتی ہے، وجود میں نہیں۔

موجودہ دنیا جس میں ہم دینی بیانیے کے فقدان کا المیہ جھیل رہے ہیں، اپنی اصولی بناوٹ میں مغربی ہے۔ یعنی ساری دنیا یا تو مغربی بن چکی ہے یا ایسا بننے کے انتظار میں ہے۔ اس بات کا ادراک کیے بغیر ہم آج کی دنیا کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکتے۔ بظاہر کچھ چیزیں مغرب کی schemes of things سے باہر یا اس سے متصادم دکھائی دیتی ہیں، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ چیزیں بھی مغرب کی توسیع کا ذریعہ بننے کے سوا اور کوئی قابل ذکر نتیجہ نہیں پیدا کر رہیں۔ مغرب نے دنیا کا کلاسیکی جدلیاتی نظام بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب دعویٰ (thesis) ہی ترکیب (synthesis) ہے اور جو تہذیبی یا نفسیاتی مظاہر ردّ دعویٰ (anti thesis) کے طور پر نظر آتے ہیں انہیں بھی یہ دعویٰ (thesis) یا تو نگل لیتا ہے یا پھر بالکل اجنبی، غیر مؤثر اور ڈراؤنا بنا دیتا ہے۔ تاریخ کا یہ جدید نظامِ حرکت کسی طرح کی اجزائی مزاحمت سے نہیں روکا یا بدلا جا سکتا۔ اس کے لیے ایک مجموعی نظریاتی، تہذیبی اور اخلاقی قوت یعنی ایک مکمل دعویٰ درکار ہے جو پھیلاؤ کی ایسی طاقت رکھتا ہو کہ دنیا کو اس کے موجودہ ideals اور actualities سے خالی کر دے۔ مغرب کے مکمل نظریاتی اور تہذیبی انخلا کو مقصود بنائے بغیر اسلامی بیانیہ جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ گویا آج دینی بیانیہ وہ ہوگا جو مغربی thesis کے مقابلے میں anti thesis نہیں بلکہ ایک نیا synthesized thesis بن کر سامنے آئے گا۔ اسلام اپنے مزاج ہی میں محض anti thesis ہونا قبول نہیں کرتا، بلکہ یہ ایسا synthesis ہے جو خود سے مغائرت رکھنے والے جدلیاتی، تاریخی، اخلاقی ڈھانچوں (structures) کو بے اثر اور بے معنی بنا دیتا ہے اور حق اور زمانے کی حقیقی نسبت کا انکشاف کر دیتا ہے، جو جوہری طور پر تقدیری ہے، محض تاریخی نہیں۔

آج کی دنیا ایسی ہو چکی ہے کہ اس میں بامعنی اور پراثر طریقے سے موجود رہنے کے لیے ہر رُخ پر مغرب کا سامنا ہے۔ مغرب سے اپنے تصادم یا توافق یا لاتعلقی کو اچھی طرح متعین کیے بغیر کوئی ایسا نظریہ اور تصور باہر کی دنیا ہی نہیں ذہن میں بھی اپنی تشکیل کا جواز اور گنجائش نہیں پیدا کر سکتا' جو اپنی اساسات اور مقاصد میں مغرب سے مختلف ہے اور مختلف رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی زندگی اور عقیدے کے تعلق کو نتیجہ خیز سطح پر بروئے کار لانے کے لیے جہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارا دین اور اس کے بنیادی مطالبات کیا ہیں' وہیں اس بات کا فہم بھی ناگزیر ہے کہ مغرب کیا ہے اور دنیا پر اس کی عملی اور علمی حکومت کے اسباب' ذرائع اور مقاصد کیا ہیں؟

مغرب کے عالمگیر غلبے کے بنیادی اسباب یہ ہیں:

(۱) علم اور اخلاق کے بارے میں تمام مذہبی اور کلاسیکی تصورات کو بالکل منقلب کر دینا۔

(۲) انسانی شعور کو ہر طرح کے مابعد الطبیعی پن سے خالی کر دینا' بلکہ ایسے امور کے بارے میں اس میں وحشت' تحقیر' انکار اور لاتعلقی کے رویے پیدا کر دینا۔ ان رویوں کے نتیجے میں جو حسی بلکہ جبلی اور افادی شعور پیدا ہوا اس شعور کو باقی دنیا کے لیے بھی علم کا واحد معیار بنا دینا۔ آزادی کے ایسے تصور کی تشکیل کر کے اسے ایک عالمگیر توسیع دینے میں کامیابی حاصل کر لینا جس کا زیادہ زور انکار کی طرف ہے۔ یہ انکار یا خوئے انکار' جسے مغرب نے آزادی کا عنوان دیا' دراصل انسان کے ہمہ گیر ماضی اور اس کے تمام مشمولات سے چھٹکارا پانے کے لیے تھا۔ یہ آزادی عمل میں کبھی کسی ایجابی قدر تک نہیں پہنچی اور نہ مغرب اپنے لوگوں کو یا باہر کی دنیا کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ آزادی کو اس کے اپنے بنائے ہوئے نقشے سے باہر کسی تعمیر کا ذریعہ بنائیں۔ اس یک رخی آزادی نے دنیا میں تبدیلی کا سارا نظام مغرب کے ہاتھوں میں دے دیا اور یہ تبدیلی بھی ایسی تھی جس نے مختلف ناموں سے انسانی ماضی کو اس کی کلیت کے ساتھ رد نہیں بلکہ غائب کر دیا۔ شعور کی فطری ساخت میں کامیابی کے ساتھ بنیادی ترمیم کر دینے کے بعد اس مشروط آزادی نے' جو بظاہر غیر مشروط نظر آتی ہے' انسان کا اپنے بارے میں تصور بدل کر رکھ دیا۔ مغرب کی غالباً سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اس نے تصورِ انسان کو یکسر تبدیل کر دیا۔

مغرب کو سمجھنا ہے تو اس کے تصورِ انسان کو اچھی طرح جاننا ہوگا۔ یہ اس کے تجزیے کی کنجی ہے جسے استعمال کیے بغیر ہم اس تہذیب کے اندر نہیں داخل ہو سکتے۔ اس نوزائیدہ تصورِ انسان کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ آدمی ایک مادی وجود ہے جس کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ یہ غیر مخلوق ہے۔ اس مادّی وجود کے دو اصولی مطالبات ہیں: خوشی اور افادیت۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کی کوششوں کے نتائج علمی بھی ہیں اور اخلاقی بھی۔ خوشی اخلاق کا idea ہے اور افادیت علم کا۔ چونکہ انسان مادّی وجود ہے' لہٰذا مسرت اور فائدے کا دائرہ بھی غیر مادّی نہیں ہو سکتا۔ یعنی روحانی خوشی اور اُخروی نفع بے معنی بلکہ غیر انسانی تصورات ہیں۔ خوشی ایک ایسی کیفیت ہے جس میں جبلت اور ذہن دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اس میں جبلی عنصر نکال دیا جائے تو خوشی کا پیکر ناتمام رہ جاتا ہے۔ اسی طرح افادیت محض مادّی ہے' گو کہ اس میں کچھ اخلاقی مضمرات بھی ہو سکتے ہیں' لیکن وہ اخلاقی مضمرات بھی کسی

بڑے تصور کا حصہ نہیں ہیں یا کسی مافوق مادّی مقصود کی طرف یکسو ہونے کے نتائج نہیں ہیں' بلکہ ایک پہلو سے نفسیاتی اور دوسری جہت سے انتظامی ہیں۔ مثلاً کسی کو فائدہ پہنچانا نفسیاتی تسکین کا سبب بھی ہے' لیکن اس سے بڑھ کر اس کی وجہ سے ریاست اور معاشرے کو درکار ایک قانونی اور عملی ہم آہنگی کا قیام بھی ممکن ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ خوشی اور افادیت کے اصول کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس پر استوار ہو جانے سے آدمی اس دنیا کا نظام کامیابی سے چلا سکتا ہے جس کا ایک سرا جبلت ہے اور دوسرا مادیت۔ مغرب ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں ایک نئی دنیا اور نیا انسان پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔ مغربی تصورِ انسان کے ان بنیادی عناصر کو اگر گرفت میں لایا جا سکے تو ان کی تہذیب کو چلانے والا پورا نظام اپنے ضروری اجزاء کے ساتھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔

☆☆☆

مغرب کے غلبے کے اسباب کو تاریخی عوامل کے معنی میں لیا جائے تو ہمیں مغربِ جدید کے چند تشکیلی مراحل دیکھنے ہوں گے: Anthropological Metaphysics جس میں یونانی mythology سے لے کر معروف عیسائی عقائد شامل ہیں+ Romanization+Cartesian Dualism+Skepticism+ افادیت پسندی کا فلسفہ+ انکارِ دین+ تجربیت کا فلسفہ + Scientism+Capitalism ۔ ان مرحلوں کو مربوط انداز سے طے کر کے جدید مغرب وجود میں آیا۔

(۱) Anthropological Metaphysics: جسے مادّی مابعد الطبیعیات کہنا چاہیے۔ یونان جو مغرب کی جنم بھومی ہے وہاں سے دیکھنا شروع کریں اور عیسائیت کی معروف شکل تک پہنچیں تو ایک ہی بات تسلسل کے ساتھ نظر آتی ہے کہ اس مابعد الطبیعیات میں خدا کی کوئی مرکزی جگہ نہیں ہے' یا عیسائیت کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا خالص نہیں ہے۔ ایسی مابعد الطبیعیاتی روایت میں بہت آسانی کے ساتھ ممکن ہو جاتا ہے کہ دینی مابعد الطبیعیات یعنی عقائد سے پوری مناسبت پیدا نہ ہو اور انہیں کسی بھی مرحلے پر رد کر دینا کوئی بڑا مسئلہ نہ بنے۔ مغرب کے ساتھ یہی ہوا کہ خدا کا تصور دینی نہ ہونے کی وجہ سے پہلے یہ عقلی حقیقت بنی' پھر اخلاقی ideal بنا اور پھر نفسیاتی ضرورت تک محدود ہو کر رہ گیا' جسے نفس پر تسکین کے دیگر ذرائع کھول کر اس کے اندر سے خارج کیا جا سکتا ہے۔

(۲) Romanization: عیسائیت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے صدی دو صدی بعد ہی ایک ایسا دین بن گئی تھی جس کا مرکز خدا نہیں تھا بلکہ مسیح علیہ السلام تھے اور خود آنحضرتؑ بھی ایک پہلو سے خدا نما انسان تھے اور دوسرے پہلو سے انسان نما خدا۔ اس دین کو طاقت کے بغیر حکومت کرنے کی عادت پڑ گئی تھی' لیکن چونکہ ایسا زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے لہٰذا جب حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے طاقت کی لازمی ضرورت سامنے آئی تو عیسائیت کو اپنے بانیوں کے قاتلوں کے ساتھ یعنی طاقت کے واقعی مظاہر کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑا۔ رومیوں کی دنیاوی طاقت نے اہل کلیسا کے روحانی دبدبے کو سب سے بڑا سہارا فراہم کیا۔ اس Romanization سے عیسائیت کی طبیعت میں رچ بس

جانے والی دنیا بیزاری کا غیر فطری ڈھب سے خاتمہ ہوگیا' جو اس کے پیشواؤں میں نہیں تھی' لیکن بہرحال اس کی روایت میں مرکزی درجہ رکھتی تھی۔ گویا پہلے مرحلے میں تصورِ خدا بدلا اور اس مرحلے میں تصورِ دنیا۔ اور یہیں سے دین اور دنیا کی مستقل دوئی کا آغاز ہوا۔

(۳) دیکارت کی ثنویت (Cartesian Dualism): رومن دور میں رونما ہونے والی دین و دنیا کی دوئی بعض تاریخی اسباب سے ایک بہت بڑے نتیجے میں صرف ہوگئی' وہ تھا ذہن اور مادہ' یا روح اور جسم کی دوئی کا نظریہ' جس نے ناقابلِ یقین تیز رفتاری کے ساتھ ایسا پھیلاؤ اختیار کرلیا کہ شعور اور وجود کی تعریف متعین کرنے کا واحد لائق اعتبار اور قابلِ عمل ذریعہ بن گیا۔ یہ گویا رومیوں کے سہارے سے محروم ہوجانے والی عیسائیت کو ایک باعزت راہ فراہم کرنے کی کاوش تھی۔ اس میں مادّہ حقیقی اور غیر مادی اعتباری ہوگیا۔

(۴) تشکیک (Skepticism): یعنی خدا کو جاننے میں ایسی بے بسی جو خدا کو نہ ماننے کا ٹھوس جواز بن جائے۔ اس کے بانی اور سب سے بڑے نمائندے ڈیوڈ ہیوم کے یہاں تشکیک کا یہی مصرف ہے کہ اقرار کو اتنا ناممکن بنادیا جائے کہ انکار بغیر کسی دعوت و اعلان کے ناگزیر ہوجائے۔ ثنویت کی طرح تشکیک نے بھی مغرب کو اندر سے حتماً بدل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس تشکیک کا پہلا حصہ یہ تھا کہ خدا کا علم تو صحیح ہو ہی نہیں سکتا' دوسرا حصہ یہ تھا کہ دنیا کا علم بھی قطعی نہیں ہے۔ یہ گویا بیج تھا knowledge & technology کے اس blend کا جو آج مغرب کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ علم کا حتمی نہ ہونا معیشت اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے' اور اس کا دروازہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیوم ہی نے کھول دیا تھا۔ علم حتمی ہوجائے تو ان دونوں کی نشوونما پر روک لگ جائے گی۔ یہ نکتہ ہم آگے capitalism کے بیان میں کھولیں گے۔ تشکیک کا مرحلہ اس لحاظ سے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے ذہن اور شے کی اپنی اپنی تعریف اور حدود کے ساتھ ساتھ ان کے تعلق کا بنیادی منہج بھی پوری طرح بدل گیا۔ اس دوطرفہ تبدیلیٔ ماہیت اور انقلابِ تناظر کو بھی مغربِ جدید کی بڑی بنیادوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

(۴) افادیت پسندی (Utilitarianism): ڈیکارٹ کی آمد کے بعد یعنی روح اور مادّے میں اصولی اور مستقل دوئی پیدا ہوجانے کے بعد' بلکہ اس کے نتیجے میں' انسان کا اپنے بارے میں اور اپنی دنیا کے بارے میں جو کلاسیکی تصور تھا وہ بالکل بدل کر رہ گیا۔ روح اور مادّہ یا خدا اور دنیا علم اور وجود کی بالکل لاتعلق قسموں میں بٹ کر رہ جائیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ انسان کی زندگی کے تمام قوانین اور مقاصد مابعدالطبیعی یا دینی اصول سے بالکل منقطع ہوجائیں۔ دیکارٹ کی فکر نے مغرب کے ذہن کو اس طرح condition کردیا کہ اس کے لیے خدا کو ماننے کا پورا عمل نہ صرف یہ کہ علمی نہیں رہا بلکہ ذہن میں اس کی مرکزیت غائب ہوجانے سے وہ دینی یا روحانی سیاق وسباق میں اخلاقی بھی نہیں رہ گیا۔ خودی کی آزاد' غیر منضبط اور نامربوط خود آگاہی' جو عقلی سے زیادہ جبلی اور علمی سے زیادہ احساساتی تھی' اس نے وجود کی نفسیاتی معنی میں بھی subjective structuring کو کچھ ایسا بنادیا کہ انسان کے لیے اپنی حقیقت اور غایت کو اپنے باہر سے اخذ کرنا بہت مشکل ہوگیا۔ ایک ایسے ماحول میں

جہاں مادہ ہی لائق تصدیق رہ گیا ہو وہاں چیزوں کو دیکھنے کا بنیادی تناظر وہ نہیں رہتا جو مابعدالطبیعی حقائق کو ماننے سے تشکیل پاتا ہے۔ حق یا حقائق کی بے مرکز subjectivization نے ذہن اور طبیعت دونوں کو محض مادیت کی طرف یکسو ہونے پر مجبور کر دیا۔ بنیادی تناظر کی اس تبدیلی سے انسان نے اپنے بارے میں کچھ ایسے فیصلے کیے جن کا تعلق دین وغیرہ سے نہیں تھا۔ ان میں سے ایک فیصلہ افادیت پسندی (utilitirianism) کا تھا' یعنی ہر چیز' ہر خیال' ہر عمل کو دنیاوی پیمانے پر مفید ہونا چاہیے' اور جو امر یا نظریہ دنیاوی افادیت نہیں پیدا کرتا اسے انسانی زندگی کی صورت گری کرنے والے لازمی عناصر سے نکال دینا چاہیے۔ خدا اور انسان کے تعلق میں پہلی ہمہ گیر دراڑ یہیں سے پڑی' جس کی وجہ سے مذہب کی اعتقادی ساخت تو غائب ہوئی ہی تھی' اس کے اخلاقی اصول بھی بے مصرف قرار پائے۔ یعنی اب مادہ ہی حقیقت ہے اور دوسروں کو خوش رکھنا' اخلاق۔ افادیت پسندی کا نظریہ اس شدت کے ساتھ مانا گیا کہ مغرب کی تقریباً تمام علمی' سیاسی' معاشی روایتیں' اس نظریے کی تصدیق کے لیے پیدا ہوئیں۔ یہ دیکھنا اب شاید زیادہ مشکل نہیں ہے کہ خدا پرستی کا سب سے مقبول متبادل دراصل یہی افادیت پرستی ہے۔ اس social theory میں افادیت کا مفہوم صرف اتنا نہیں ہے کہ مادّی فوائد میسر آ جائیں' بلکہ اس کا ایک نفسیاتی version بھی ہے' اور وہ ہے حصولِ مسرت' یعنی انسان کو بس ایک خوش حالی کی ضرورت ہے جو اس کے حالات میں بھی ہو اور کیفیات میں بھی۔ جس طرح مادّی افادیت کے امکانات لامتناہی ہیں' نفسیاتی مسرت کے ذرائع بھی غیر محدود ہیں۔ اسی سے آزادی کے اس تصور کا بیج پڑا جو آج ایک بڑے درخت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے' اور یہیں سے خدا اور آخرت سے لاتعلقی کی وہ بنیاد استوار ہوئی جس پر آج مغربِ جدید نے پوری عمارت تیار کر رکھی ہے۔ مفادِ عاجلہ کے حصول کو مقصدِ زندگی بنا کر ظاہر ہے کہ آخرت اور خدا کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

(۵) انکارِ دین (Antheism): جب مذہبی لوگوں نے افادیت پسندی کی زمین پر بھی چلنا سیکھ لیا تو ان کے قدم اکھاڑنے کے لیے ایک زلزلہ ایجاد کیا گیا۔ یہ زلزلہ کیا تھا؟ utilitanism کے اصل چہرے کی رونمائی! یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کب' مگر یہ بہرحال تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انکارِ دین کا رویہ افادیت پسندی کے پہلے ہی دور میں کچھ کچھ سامنے آنے لگا تھا' لیکن اس رویے کا مکمل اظہار مختلف شعبوں میں کچھ عرصے بعد ہوا۔ انکارِ دین محض کلیسا کے استبداد کا ردِعمل نہیں ہے' بلکہ اصل میں افادیت پسندی کے شجر کا پھل ہے' کیونکہ افادیت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمات اور عقائد اور پھر نظری مابعدالطبیعیات کو شعور کی اقلیم سے خارج کر دیا جائے' اور انسان کو یہاں تک پہنچا دیا جائے کہ وہ خدا کو اپنی نادانی اور کمزوری کا نتیجہ سمجھنے لگے۔ یہ انکارِ دین ذہن اور زندگی کے ان گوشوں میں بھی سرایت کر گیا جو neutral zones کی طرح تھے۔ یعنی ٹھیٹھ دنیاوی اور نفسیاتی علوم میں بھی کسی سمجھ میں آ سکنے والے جواز و ضرورت کے بغیر خدا اور دین سے انحراف یا لاتعلقی کا رنگ داخل کر دیا گیا۔ مثلاً میز بنانے میں خدا کو ماننا یا نہ ماننا لازمی شرط نہیں ہے' لیکن اس سطح پر بھی اس رویے کو گویا رچا بسا دیا گیا۔ انکارِ

دین کی ایسی روایت کے تسلسل میں جدیدیت پیدا ہوئی جس کی روح ہی انکار ہے۔ شروع میں آرائشی طور پر بعض دنیاوی مسلمات کا انکار کیا گیا' لیکن فوراً ہی بعد اس انکار کا رخ خدا' دین وغیرہ کی طرف پھیر دیا گیا۔ اب جدیدیت ایک منتخب انکار کی آزادی بن کر سامنے آئی۔ چونکہ مغرب اپنے تمام اصول واقدار کو آفاقی بنانے میں بہت حد تک کامیاب چلا آرہا ہے لہٰذا اہل دین کو انکارِ دین کے اس مزاج کو' جسے مغربِ جدید میں پیدا ہونے والے تمام علوم کی پشت پناہی حاصل ہے' نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور اس کا سامنا کرنے کے لیے درکار وسائل کا پورا شعور اور استطاعت حاصل کرنی چاہیے۔ سردست اسے ایک کلامی اور منطقی مبحث سمجھ کر جو طبع آزمائی کی جارہی ہے' ایک تو اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور دوسرے وہ اس مزاج کو مزید تقویت پہنچا رہی ہے۔ اس زہریلے سیلاب سے بچنے کے لیے زندگی اور اس کے مؤثرات پر جس طرح کی قدرت درکار ہے وہ فی الحال کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم انکارِ دین کو ایک مجموعہ استدلال سمجھ کر اس کی تردید کی اَن گڑھ کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ گویا ایسی تیر اندازی ہے جو دشمن کے مخالف رخ پر کی جارہی ہے۔

(۶) تجربیت (Empirism): مغرب میں دیکارٹ کے بعد ایک پورا نظریہ علم پیدا ہوا جس کا یک عنوان تجربیت (Empiricism) ہے' یعنی علم کا صحیح ہونا حسّی تصدیق سے مشروط ہے۔ دائرۂ حواس سے باہر ہم کوئی بامعنی تصور تو تشکیل دے سکتے ہیں لیکن اس تصور کو اس کی ممکنہ تاثیر کے باوجود علم نہیں کہا جائے گا۔ اس مکتبہ فکر میں محسوس ہی معلوم ہے اور معقول کا کردار محسوسات کی تنظیم' توجیہہ اور معنویت سازی تک محدود ہے۔ گو کہ حسّی علم پر اصرار کرنے والی روایت قدیم سے چلی آرہی تھی لیکن دیکارٹ سے پہلے تک اس روایت نے ''علم کیا ہے؟'' کا ایک مستقل جواب تیار کیا اور اسے ذہن اور شے کے تعلق اور اس تعلق سے برآمد ہونے والے نتائج' بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ اس تعلق کے مقاصد کو بھی' اپنے بنائے ہوئے جواب کے دائرے میں سمولیا۔ شروع شروع میں تصدیق کے تمام حدود حسی نہیں تھے' بلکہ منطقی استدلال کو بھی کسی علم کی صحت میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور تھا' لیکن آگے چل کر منطقی معقولات بھی غائب ہوگئے اور تصدیق کا محض ایک مطلب باقی رہ گیا: حسی تجربہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ دیکارت تجربیت پسند (Empiricist) نہیں تھا' تاہم اس کے نظریۂ ثنویت نے تجربیت کے لیے سنگ بنیاد کا کام دیا۔ تجربیت کو جب فلسفے کے علاوہ دیگر سائنسی اور معاشرتی علوم کی تائید بھی حاصل ہوگئی تو اس نے ایک مجموعی ذہن تعمیر کیا' یعنی جدید آدمی کا ذہن' جس کا ایک موضوع بھی وہ دنیا تھی جو صورت و معنیٰ دونوں اعتبار سے مادّی تھی۔ تجربیت کے قوام سے بننے والا مجموعی ذہن وہی ہے جس نے جدید مغرب کو اس کے تمام اصول و مظاہر سمیت جنم دیا' اور اب وہی اسے چلا رہا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام محرکات و مقاصد اسی ذہن سے متعین ہوتے ہیں اور نفسیات سے لے کر تہذیب تک کے تمام مراحل اسی کی رہنمائی میں طے ہوتے ہیں۔ اس ذہن کا غلبہ اب مقامی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ عالمگیر ہونے کی کیفیت رکھتا ہے۔ اب یہ بات شاید فرض بھی نہ کی جاسکے کہ تجربیت کے رویے سے بننے والے دائرے کو کسی بھی استدلال سے توڑا جاسکتا ہے۔ مغرب اپنے بعض دیگر اصول کی

طرح صحت علم کے اس عقیدے کو ایک ایسا معیار بنانے میں پوری طرح کامیاب ہو چکا ہے کہ دنیا کے جو حصے یعنی غیر مغربی تہذیبیں فی الحال اس طغیانی سے کسی قدر بچی ہوئی نظر آتی ہیں ان کا رویہ بھی بچ کر خوش ہونے والوں جیسا نہیں ہے بلکہ وہ اس طغیانی میں چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہی ہیں' رشک کے ساتھ' احساسِ کمتری کے ساتھ۔ اس وقت یہ کہنا خود کو دھوکہ دینا ہے کہ وجود اور علم دونوں میں واحد معیار مغرب نہیں ہے۔ باقی پسماندہ قومیں ہیں جو اس معیار پر پورا اترنے کی کوشش کر رہی ہیں یا اس کی حسرت میں مبتلا ہیں۔ دیگر پہلوؤں سے قطع نظر تجربی ذہن اب دینی علم کی روایت میں بھی کارفرما ہو چکا ہے۔ اس معاملے میں سارے عالمِ اسلام کی ایک سی صورتِ حال ہے۔ روایتی عقیدہ یا فکر عملاً اجنبی ہو چکا ہے اور دین کی اس تعبیر کو مسلمانوں میں مقبولیت اور علمی اہمیت حاصل ہو چکی ہے جو مغرب کے بنائے ہوئے گویا عالمگیر ذہن سے مناسبت رکھتا ہے۔ ٹھیٹھ مذہبی فکر اسے تجدد وغیرہ کا عنوان دے کر فی الحال رد تو کر رہی ہے' لیکن یہ تردید آج بننے والی علمی فضا کے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی اور کوئی کشش بھی نہیں رکھتی۔ دین کی منتقلی اور تسلسل کا عمل ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت کی ایسی روایت کی پاسداری کے ساتھ ممکن ہو سکتا ہے جو آغازِ دین سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن آج بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دین کے ساتھ خلقی مناسبت رکھنے والا علم اور اخلاق' موجودہ آدمی اور موجودہ دنیا میں کسی طرح کی تاثیر نہیں رکھتے۔ یعنی اب ٹھیٹھ مذہبی فکر نہ آدمی کو بدل سکتی ہے اور نہ دنیا کو' اور جہاں اس کے تصرفات کا مظاہرہ ہو رہا ہے' وہاں وہاں تخریب کی حکومت نظر آتی ہے' تعمیر کا پہلو نہیں دکھائی دیتا۔ اس صورتِ حال میں' جو تخیل نہیں ہے بلکہ ہر شخص کو دکھائی دے سکنے والا واقعہ ہے' مذہب کی ترویج تو دور کی بات ہے' اس کے دفاع کا سامان بھی ہمیں میسّر نہیں۔ تجربیت کی وبائے عام کا ایک اثر یہ ہے کہ علمی سطح پر ایمانیات کو حِسی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اخلاقیات میں اللہ اور آخرت سے دوری پر مطمئن رہنے والی خدمت خلق اور تسخیر دنیا ایک جنون کی طرح پھیل رہی ہے اور مسلم معاشروں میں پھیلائی جا رہی ہے۔ یہ باتیں مایوسی کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ہر سچے آدمی کا مشاہدہ ہیں۔ مذہبی ذہن جب تک اس بھیانک منظر کو خوش فہمی کے بغیر دیکھنے کی صلاحیت نہیں پیدا کرے گا' بالآخر اپنے دین اور ایمان کو بھی اسی منظر کا حصہ بنانے پر مجبور ہو جائے گا' بلکہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایمان کی تاثیر فی الذہن اور اخلاق کی تاثیر فی الاشیاء کو بحال کیے بغیر اور مغرب سے مکمل فصل اختیار کیے بغیر اسلامی دنیا کی بقا محالات میں سے ہے۔

(۷) سائنس پرستی (Scientism): کا مطلب ہے سائنس کو معیارِ حق و باطل بنا لینا۔ سائنٹزم کے دو حصے ہیں' ایک پرانا اور ایک نیا۔ پرانے حصے میں دین کو ماننے کی بھی گنجائش نکالی جاتی ہے' اس شرط کے ساتھ کہ دین اتنا ہی سچا اور یقینی ہے جتنا سائنس سے ثابت ہو۔ جو عقائد سائنس سے ثابت نہیں ہیں ان پر ایمان عملاً معطل اور ذہناً مفقود رہتا ہے۔ نیا حصہ' دینیات کو مکمل طور پر رد کرتا ہے اور دینداری وغیرہ کو غیر سائنسی رویہ گردانتا ہے۔ سائنٹزم تجربیت ہی کا ایک مظہر ہے' بس فرق اتنا ہے کہ تجربیت میں تمام علوم کو برابری کے ساتھ موجود رہنے کی اجازت ہے' لیکن سائنٹزم میں ہر علم سائنس کا محکومِ محض ہے اور اس محکومیت کو مانے بغیر کسی بھی علم کا کوئی جواز نہیں

ہے۔ دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ تجربیت کا بنیادی کام یہ ہے کہ صحیح اور غلط علم میں تمیز کی جائے' جبکہ سائنٹزم میں معاملہ صرف صحت علم اور اس کی شرائط تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں کسی امر کا حقیقی یا غیر حقیقی ہونا بھی طے کیا جاتا ہے۔

(۸) سرمایہ داری (Capitalism): مغربی ذہن کے مطابق کیپیٹل ازم ایک ابدی تقدیر ہے جو انسان نے دنیا کی لوحِ محفوظ پر لکھی ہے۔ آج کی دنیا میں انسان سے بلاواسطہ یا بالواسطہ نسبت رکھنے والے تمام ہی معاملات کیپیٹل ازم کے دستِ تصرّف میں ہیں۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ ریاست دینی بنے گی تو اس کی مرضی سے اور سیکولر ازم اختیار کرے گی تو اس کی اجازت سے۔ کیپیٹل ازم نے انسان کو آزمائش کے ماحول اور بڑے فیصلے کرنے کی مشکلات سے نکال دیا اور عالمگیر سطح پر اپنا یہ تاثر منوالیا ہے کہ سارے مسائل ایک اَن دیکھے نظام سے حل ہو جائیں گے جس کی باگ ڈور کیپیٹل ازم کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لیے نظریے کا لفظ چھوٹا ہے' اسے تو گویا انسانوں کا بنایا ہوا ''دین'' کہنا چاہیے' تو بہرحال اس نے فرد کے معاشی اختیارات سے آغاز کر کے غیر محدود ملکیت کے تصور کی تشکیل کرتے ہوئے اب ایک کسوٹی اور حکم کی شکل بنالی ہے' جس کی تصدیق اور امر کے بغیر انسانی ذہن اور زندگی کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔ اور ایسا صرف مغرب میں نہیں ہے' مغرب تو کسی کونے کھدروں میں کیپیٹل ازم سے آزادی کا ماحول رکھتا ہے' یہ تسلط مغرب کے باہر کی دنیا پر زیادہ ہے' جہاں بلاشبہ Capitalist agenda کی ادنیٰ سی خلاف ورزی محالات میں سے ہے۔ خصوصاً مسلم ریاستیں اور معاشرے کیپیٹل ازم کے زیرنگیں ہونے کے سب سے واضح مظاہر ہیں۔ یہاں دنیا کے ساتھ ساتھ دین کو بھی اس سے موافقت اور سازگاری پیدا کرنے پر مجبور یا مائل ہونا پڑ رہا ہے۔ دینی زندگی میں سے آخرت کے تصور کو جس باریکی اور مہارت سے بے دخل اور بے اثر کر دیا گیا ہے یہ کیپیٹل ازم ہی کا کارنامہ ہے' جس پر جدید مسلمان فخر کرتے ہیں۔ غرض مختصر یہ کہ انسان' دنیا اور خدا کے تمام دینی تناظرات اور آفاقی تصورات پہلی مرتبہ کیپیٹل ازم کے ہاتھوں اندر سے منقلب ہوئے ہیں اور تمام کلاسیکی اور روایتی جدلیات اس کے ہاتھوں بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ حق و باطل' صحیح و غلط' آزادی و غلامی' فرد و معاشرہ' وغیرہ ایسے تمام جدلیاتی تناظر کیپیٹل ازم نے اگر پوری طرح بدلے نہیں تو بھی ان کی معنویت اور حیثیت کو یکسر تبدیل کر دیا ہے' اور یہ سب کچھ مسلم دنیا میں اپنی انتہا پر نظر آتا ہے۔ کیپیٹل ازم کا crude لفظوں میں خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت ایک بہت چھوٹی اقلیت کے تصرف میں رہے' لیکن احساسِ آزادی کے ساتھ' خوشی کے ساتھ اور سامانِ عافیت کے ساتھ۔ یہ چھوٹی سی اقلیت آج کل کی اصطلاح میں کوئی مجموعۂ افراد نہیں ہے بلکہ corporations کا اکٹھ ہے' جس کے اندازِ کار اور مقاصد کا شاید کسی کو پوری طرح علم نہ ہو۔ ان کے پاس مشکل کا حل بھی ہے اور مشکل پیدا کرنے کا فن بھی۔ کیپیٹل ازم مشکلات کی پیدائش اور ان کے مؤثر حل کی نمائش کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے۔ کسی موقع پر تفصیل میں جانا پڑا تو یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ کیپیٹل ازم اپنے مبادی اور تفصیلات میں کیا ہے؟ اور اس کے اندر وہ کون سا وصف ہے جس کی وجہ سے اس کی شکست اور خاتمہ ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ بہرحال

جمہوریت، حقوقِ انسانی، اوپن مارکیٹ اور غیر مشروط آزادی، انسان کے بنائے ہوئے اس دین کے بنیادی ارکان ہیں، مگر یہ الفاظ اپنے معنی بھی ساتھ لائے ہیں، پہلے سے موجود معنی کو قبول نہیں کرتے۔ کیپیٹل ازم کسی عقیدے یا روایتی مسلمے یا کسی بھی علم وغیرہ کی تردید سے دلچسپی نہیں رکھتا، یہ ہر چیز کو ایک binding context کا پابند بنا دیتا ہے۔ مذہبی ذہن اس بات کو سمجھنے میں دیر لگا رہا ہے کہ دنیاوی کی طرح دینی علم کا بھی سیاق وسباق (context) اور حیطۂ تسلیم وتاثیر بدلتا رہتا ہے۔ یہ فطری قانون کیپیٹل ازم نے سمجھا ہے اور اسے پوری تفصیل سے کل انسان، کل دنیا پر apply کر کے دکھایا کہ context ہی علم ہوتا ہے۔

یہ وہ چند تاریخی اسباب تھے جس نے مغرب جدید کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مغرب کو جاننا اب ''know thy enemy'' نہیں بلکہ بدقسمتی سے ''know thyself'' کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری کا جادو لاس ویگاس سے زیادہ دبئی کے ڈاؤن ٹاؤن میں چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ خدا کی بستی کو دکان میں کیسے ڈھالا جاتا ہے، اس کا مشاہدہ حرمین شریفین کے پیش وعقب میں شاید مین ہٹن سے زیادہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں یورپ کو انسان کی اخلاقی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ گردانا ہے۔ آخر میں اقبال کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کا ایک حصہ بلاتبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ — تا کجا در قیدِ زُنّارِ فرنگ؟
زخم ازوٗ نشتر ازوٗ سوزن ازو — ما و جوئے خون و اُمیدِ رفو!
خود بدانی بادشاہی قاہری است — قاہری در عصرِ ما سوداگری است
تختۂ دُکّاں شریکِ تخت و تاج — از تجارت نفع و از شاہی خراج
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است — بر زبانش خیر و اندر دل شر است
گر تو میدانی حسابش را درست — از حریرش نرم تر کر پاسِ تست
بے نیاز از کار گاہِ او گذر — در زمستاں پوستینِ او مخر
کشتنِ بے حرب وضرب آئینِ اوست — مرگہا درِ گردشِ ماشینِ اوست
بوریاے خود بہ قالینش مدہ — بیذق خود را بہ فرزینش مدہ
گوہرش تف دار و در لعلش رگ است — مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است
رہزنِ چشم تو خوابِ مخملش — رہزنِ تو رنگ و آبِ مخملش
صد گرہ افگندۂ در کارِ خویش — از قماشِ او مکن دستارِ خویش
ہوشمندے از خمِ او مے نخورد — ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد
وقتِ سودا خند خند و کم خروش — ما چو طفلانیم و او شکر فروش
محرم از قلب و نگاہِ مشتری است — یا رب ایں سحر است یا سوداگری است

تاجرانِ رنگ و بو بردند سود ما خریداراں ہمہ کور و کبود
آنچہ از خاکِ تورست اے مردِ حر آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند
اے زکارِ عصرِ حاضر بے خبر چرب دستیہاے یورپ را نگر!
قالی از ابریشمِ تو ساختند باز او را پیشِ تو انداختند
چشمِ تو از ظاہرش افسوں خورد رنگ و آبِ او ترا از جا برد
واے آں دریا کہ موجش کم تپید
گوہرِ خود را ز غوّاصاں خرید!

☆ تو فرنگیوں کو بھی سمجھتا ہے اور ان کے کام کا بھی' کب تک فرنگ کے زنار میں قید رہے گا؟
☆ زخم بھی اُسی کی وجہ سے' نشتر بھی اُسی کا ہے' پھر وہی اس زخم کو سینے والا ہے۔ ہم ہیں اور جوئے خون۔ اور اسی سے زخموں کے سینے کی امید رکھے ہوئے۔
☆ تو خود جانتا ہے کہ پادشاہت چیرہ دستی سے قائم ہوتی تھی' مگر اس دور میں یہ چیرہ دستی تجارت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔
☆ آج کل دکانداری تخت و تاج کی شریک بن گئی ہے' تجارت سے نفع حاصل کرتے ہیں اور حکومت کے ذریعے خراج۔
☆ وہ حکمران جو تاجر بھی ہے' اس کی زبان پر بھلائی کی باتیں ہیں مگر دل کے اندر شر ہے۔
☆ اگر تو اس کے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لے تو تجھے معلوم ہوگا کہ اس کے ریشم سے تیرا کھدر بہتر ہے۔
☆ اس کے کارخانوں کی طرف توجہ نہ دے' موسم سرما میں بھی اس سے گرم کپڑے نہ خرید۔
☆ بغیر جدال و قتال کے قتل کرنا اس کا طریق کار ہے' اس کی مشینوں کی گردش میں کئی اموات پوشیدہ ہیں۔
☆ اپنا بوریا چھوڑ کر اس کا قالین نہ لے۔ اس کے وزیر کے عوض اپنا پیادہ نہ دے۔
☆ اس کا موتی عیب دار اور لکیر دار ہے۔ یہ سوداگر اپنی کستوری کتے کی ناف سے حاصل کرتا ہے۔
☆ اس کے مخملیں بستر پر سونے سے آنکھ کی بینائی چلی جاتی ہے۔ اس کے ریشم کی چمک دمک تجھے اپنے آپ سے بیگانہ کر دیتی ہے۔
☆ تو نے اپنے کاموں میں سینکڑوں مشکلات پیدا کر لی ہیں' اس کے کپڑے سے اپنی پگڑی نہ بنا۔
☆ کوئی سمجھدار اس کے خم سے شراب نہیں پیتا' اور جو پیتا ہے وہ اسی مے خانے کے اندر مر جاتا ہے۔
☆ وہ ہنس ہنس کے اور میٹھی زبان سے سودا بیچتا ہے۔ ہم بچوں کی طرح ہیں اور وہ مٹھائی بیچنے والے کی مانند۔
☆ وہ خریدار کی سوچ اور پسندیدگی کو جانتا ہے۔ یارب! یہ سوداگری ہے یا جادوگری؟
☆ یہ رنگ و بو (ظاہری چمک دمک) کے تاجران سارا منافع لے گئے' اور ہم خریدار اندھے کے اندھے ہی رہ گئے۔

☆ اے مردِ حر جو کچھ تیری سرزمین سے پیدا ہوتا ہے اسے کھا اور اسے پہن اور اسے فروخت کر۔

☆ وہ سمجھ دار لوگ جو اپنے آپ کو پہچانتے ہیں وہ اپنی گودڑی کو خود بُنتے ہیں۔

☆ تو جو اس دور کے طور طریقوں سے بے خبر ہے یورپ کی کاریگریوں کو سمجھ!

☆ وہ تیرے ریشم سے قالین بُنتا ہے' اور پھر اسے تیرے ہی سامنے فروخت کے لیے پیش کر دیتا ہے۔

☆ تیری آنکھ نے اس کے ظاہر سے دھوکا کھایا ہے' اور اس کی ظاہری چمک دمک نے تجھے اپنے مقام سے گرا دیا ہے۔

☆ افسوس اس دریا پر جس کی موجوں میں جوش و خروش نہ رہا' جس نے اپنے ہی موتی کو غواصوں سے خریدا!

(ترجمہ اشعار از میاں عبدالرشید)

❁❁❁

بقیہ: معرفتِ حدیث کے بنیادی علوم

یہ روایت درحقیقت ترجمان ہے سورۃ القیامہ کی: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝۲۲ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝۲۳﴾ (القیامۃ) ''اُس دن بعض چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے'' جب کہ کافروں سے متعلق فرمایا گیا: ﴿اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝۱۵﴾ (المطففین) ''وہ اپنے رب کو دیکھنے سے حجاب میں رہیں گے''۔ اس سے بھی اس بات کی دلالت ہوتی ہے کہ مؤمنین کے لیے حجاب نہیں ہوگا۔ مذکورہ حدیث کے سوا اور بھی بہت سی روایات میں یہ مضمون وارد ہے کہ جنت میں اللہ کا دیدار ہوگا' لہٰذا آیت لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کا مفہوم یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کا دیدار ممکن نہیں۔ یہی بات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بھی ثابت ہے کہ جو یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو (شب معراج میں) دیکھا وہ جھوٹا ہے' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾۔ صحیح البخاری' کتاب التفسیر' تفسیر سورہ النجم۔ یعنی دنیا میں یہ ممکن نہیں۔ اس طرح حدیث اور قرآنی آیات میں کوئی اختلاف نہیں رہتا جو بظاہر الفاظ کو سامنے رکھ کر نظر آتا ہے۔ ❁❁❁

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

اسلام میں عورت کا مقام
اور میاں بیوی کے باہمی معاملات (۳)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان ☆

تعدّدِ ازدواج

تعددِ ازدواج کے موضوع پر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک بڑی عمدہ تحریر ہے۔[۱] اس کے حوالے سے اس مسئلے سے متعلقہ جدید تاویلات' شبہات اور اضافی شرائط کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

قرآن پاک کی درج ذیل آیت اسلام کے قانونِ تعددِ ازدواج کی بنیاد ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳﴾ (النساء)

''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو' دو دو' تین تین' چار چار۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی (بیوی) پر اکتفا کرو یا وہ عورتیں جو تمہارے قبضے (ملکیت) میں آئی ہیں۔ بے انصافی اور زیادتی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔''

اس آیت کے حوالے سے پہلے ایک غلط مفروضے کو اپنے ذہن سے نکال لیں۔ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے ایسا کوئی اشارہ یا کنایہ تک نہیں مل پاتا جس سے یہ بات نکلتی ہو کہ قرآن کی نگاہ میں تعددِ ازدواج فی الاصل کوئی برائی ہے اور وہ اس کی حوصلہ شکنی چاہتا ہے۔ دورِ جدید کے کچھ نام نہاد مفسّرین اور مجتہدین کا نقطۂ نظر ہے کہ قرآن کا اصل مقصد تو تعددِ ازدواج کو مٹانا تھا' لیکن یہ چونکہ بہت رواج پا چکا تھا اس لیے اس پر پابندیاں لگا کر چھوڑ دیا گیا' تاکہ آئندہ کبھی اسے ممنوع قرار دے دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ منشا معلوم کرنے کا آخر ان کے پاس کون سا ذریعہ ہے؟ اور اگر یہ ان کی اپنی رائے ہے کہ تعددِ ازدواج فی نفسہٖ برائی ہے' تو یہ اختیار تو ان کے پاس ہے کہ قرآن کے علی الرغم وہ اس کی مذمت کریں اور اسے موقوف کرنے کا مشورہ دیں' مگر یہ حق انہیں بہرحال کسی صورت نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اپنی رائے کو زبردستی قرآن کی طرف منسوب کریں۔ قرآن

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات و مطالعہ پاکستان' گورنمنٹ کالج آف کامرس' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور

تو واضح اور صریح الفاظ میں اسے جائز قرار دیتا ہے اور اشارتاً یا کنایتاً بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ نہیں استعمال کرتا' جس سے ثابت ہو کہ وہ واقعی تعددِ ازدواج کو ایک برائی سمجھتا ہے اور اسے کسی طور پر روکنا چاہتا ہے۔

غلط تاویلات اور مفروضے

اپنے اس بے بنیاد دعوے پر یہ لوگ تاویلات کی ایک عمارت کھڑی کرتے ہیں جس کا ہر جزو بذاتِ خود بہت کمزور ہے:

(۱) ''یہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں کر/رکھ سکتا ہے' اور اگر کر/رکھ سکتا ہے تو کن حالات اور کن شرائط کے تحت۔''

اب ذرا آیت کے الفاظ پر غور کریں جس سے یہ ضابطہ نکالا جا رہا ہے۔ اس کے الفاظ سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کے مخاطب مسلمان افراد ہیں اور ان ہی سے کہا جا رہا ہے کہ ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملے میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو' دو دو سے' تین تین سے اور چار چار سے۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو۔''

اب ظاہر ہے کہ عورتوں کو پسند کرنا' ان سے نکاح کرنا اور اپنی بیویوں سے عدل کرنا یا نہ کرنا افراد کا ہی کام ہے' نہ کہ پوری قوم یا معاشرے کا۔ لہٰذا باقی تمام فقرے جو بصیغہ جمع مخاطب ارشاد ہوئے ہیں' ان میں خطاب بھی لامحالہ افراد ہی سے ماننا پڑے گا۔ اس طرح اوّل سے آخر تک یہ پوری آیت افراد کو ان کی انفرادی حیثیت سے مخاطب کر رہی ہے اور یہ بات انہی کی مرضی پر چھوڑی جا رہی ہے کہ اگر وہ عدل کر سکیں تو ایک سے چار کی حد تک جتنی عورتوں کو پسند کریں' ان سے نکاح کر لیں۔ اور اگر اس خطرہ کا احساس ہو کہ عدل نہ ہو پائے گا تو پھر ایک ہی پر اکتفا کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب تک آیت میں ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ﴾ اور ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ کے صیغہ خطاب کو فضول اور بے معنی نہ سمجھ لیا جائے' اس آیت کے ڈھانچے میں نمائندگانِ قوم آخر کس راستے سے داخل ہو پائیں گے؟ آیت کا کون سا لفظ ان کی مداخلت کا راستہ کھولتا ہے؟ اور مداخلت کی بھی یہ حد کہ اب وہی فیصلہ کریں گے کہ ایک مسلمان دوسری بیوی کر بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اور پھر 'کر سکے' کا فیصلہ کر لینے کے بعد وہ یہ بھی طے کریں کہ وہ کن حالات اور کن شرائط کے تحت کر سکتا ہے۔ حالانکہ آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صریحاً ایک مسلمان کو خود 'کر سکنے' کا مجاز قرار دیا ہے اور حالات و شرائط کے معاملے کو بھی فرد کے اپنے انفرادی فیصلے پر چھوڑ دیا ہے۔

(۲) ''ایک سے زائد نکاح اگر کیے بھی جائیں تو ان کو لازماً یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے' کیونکہ اسی غرض سے تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔''

اس تاویل کی بنیاد یہ ہے کہ آیت میں ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دوسری شادی کی اجازت صرف یتیموں کے ساتھ انصاف کرنے کی غرض سے

دی گئی ہے۔ لہٰذا یہ شادی کسی ایسی عورت سے ہی ہونی چاہیے جو کسی یتیم بچے/بچوں کی ماں ہو اور اس شادی کرنے والے کا مقصد بھی اس یتیم/یتامیٰ کے ساتھ انصاف کرنا ہو۔

اب تاویل کی یہ بنیاد سرے سے ہی غلط ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف کو تعددِ ازدواج کے لیے شرط سمجھ لیا گیا ہے۔ قرآن پاک پر تدبّر و تفکّر کرنے والا کوئی شخص بھی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ اس کتابِ مقدس میں بہت سے احکام کسی خاص موقع پر دیے گئے ہیں اور حکم دیتے وقت کئی مواقع پر اس طرح کے الفاظ آئے ہیں کہ ''اگر ایسی صورت پیش آگئی تو اس کا یہ حکم ہے''۔ ان تمام مقامات پر شرطیہ الفاظ کو اگر شرطِ حکم قرار دے دیا جائے تو اس طرح سے شریعت کی صورت ہی مسخ ہو جائے گی۔ مثلاً عرب کے لوگ اپنی لونڈیوں کو زبردستی پیشہ کرنے اور پیسے کمانے پر مجبور کرتے تھے۔ اس کی ممانعت ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (النور:۳۳) ''اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو' اگر وہ اس سے بچی رہنا چاہتی ہوں''۔ اب اس آیت کا یہ معنیٰ اخذ کرنا کیا درست ہوگا کہ یہ حکم صرف لونڈیوں سے متعلق ہے' اور یہ کہ لونڈی اگر خود زنا سے نہ بچنا چاہتی ہو تو اس سے بدکاری کا پیشہ کرایا جا سکتا ہے؟

دوسری غلطی اس تاویل میں یہ ہے کہ سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت کے بارے میں فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ دراصل تعددِ ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی ہے' حالانکہ یہ مفروضہ بذاتِ خود بے بنیاد ہے۔ عرب اور قدیم زمانے کے پورے معاشرے میں از منۂ قدیم سے تعددِ ازدواج مطلقاً مباح تھا۔ انبیائے سابقین علیہم السلام میں سے اکثر کی متعدد بیویاں تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کے ہاں خود اس آیت کے نزول سے پہلے تین ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنہن تھیں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بھی اکثر و بیشتر یہی حال تھا۔ اب جو طریقہ پہلے سے رائج چلا آ رہا ہو' ظاہر ہے کہ اس کے لیے نئے سرے سے اجازت دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن پاک کا کسی رواج سے منع نہ کرنا' بذاتِ خود اس رواج کی اجازت دینے کے ہم معنی ہے۔ اس لیے یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ یہ آیت تعددِ ازدواج کی اجازت دینے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ دراصل سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ ہو گئی ہیں' تو اس مسئلے کو حل کرنے کا مناسب طریقہ تجویز کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت میں مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ اگر تمہیں شہدائے اُحد کے بچوں کے ساتھ ناانصافی کا خطرہ ہو تو تمہارے لیے ایک سے زائد بیویاں کرنے کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہے۔ اب شہداء کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں' ان کے ساتھ نکاح کر لو' تاکہ ان کے بچے تمہارے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد اور مستقبل سے ذاتی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکالا جا سکتا کہ تعددِ ازدواج صرف اسی صورت میں جائز ہے جبکہ یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہو۔ گویا اس آیت نے کوئی قانون بتایا ہے تو وہ تعددِ ازدواج کی اجازت دینا نہیں' کیونکہ اس کا رواج اور اجازت تو پہلے سے ہی تھی۔ دراصل اس میں جو نیا قانون دیا گیا ہے' وہ یہ ہے کہ بیویوں کی بیک

وقت تعداد پر چار کی قید لگا دی گئی ہے اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صورت میں عدل کو بذاتِ خود بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے۔

اس تاویل کی غلطی اس وقت بالکل کھل جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد خود نبی اکرم ﷺ نے متعدد نکاح کیے اور کسی نکاح میں اصل محرک یہ امر نہ تھا کہ آپؐ یتیم بچوں کی پرورش کے لیے کسی خاتون کو نکاح میں لانا چاہتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی عہدِ رسالت اور اس کے بعد کئی بیویاں کیں' جن میں کنواریاں اور بے اولاد مطلقہ یا بیوائیں بھی تھیں۔ فقہائے کرام میں سے بھی کسی نے آج تک ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی﴾ کا معنی اور مفہوم یہ نہیں سمجھا کہ ایک سے زائد بیویوں کی اجازت صرف یتیم بچوں کی پرورش کے لیے ہے اور دوسری بیوی لازماً کسی یتیم / یتامیٰ کی ماں ہی ہونی چاہیے۔

(۳) ''اگر ایک مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا' کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو کروڑوں مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی' تمدنی اور سیاسی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔''

اس نرالے طرزِ استدلال کے بارے میں گزارش ہے کہ ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھے گا' تو وہ اس آزادی کو استعمال کر رہا ہوتا ہے جو اس کی خانگی زندگی کے بارے میں اللہ ربّ العزت نے اُسے دی ہے۔ اب وہ اس آزادی کو شادی نہ کرنے کے بارے میں بھی استعمال کر سکتا ہے' ایک بیوی پر اکتفا کرنے کے بارے میں بھی' بیوی مرحومہ ہونے کی صورت میں دوسری شادی کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بھی' اور کسی وقت اُس کی مرضی ہو تو ایک سے زائد بیویاں کرنے کے بارے میں بھی استعمال کر سکتا ہے' لیکن جب قوم تمام افراد کے بارے میں کوئی مستقل قانون بنا دے' تو پھر فرد کی وہ آزادی سلب ہو کر رہ جائے گی جو کہ اسلام نے اسے دی ہے۔ اب ذرا غور کریں کہ کیا اس قیاس پر قوم کسی وقت یہ فیصلہ کرنے کی بھی مجاز ہے کہ اس کے آدھے افراد شادی کریں اور آدھے نہ کریں؟ یا جس کی بیوی یا شوہر دنیا سے رخصت ہو جائے وہ نکاحِ ثانی نہ کرے؟ ہر وہ آزادی جو افراد کو دی گئی ہے' اسے بنائے استدلال بنا کر قوم کو یہ آزادی دینا کہ وہ افراد سے ان کی آزادی کو سلب کر لے' ایک منطقی مغالطہ ہی ہو سکتا ہے۔ نہیں معلوم کہ قانون میں اس طرزِ استدلال نے کب سے رواج پایا ہے؟ بالفرض تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مسلمانوں کی اکثریت ایسا کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اکثریت کے بجائے اقلیت ایسا کوئی قانون تجویز کرے اور دوسروں کی رائے کے خلاف اسے زبردستی سب پر مسلط کرنا چاہے' تو پھر ان کے اپنے بیان کردہ اصول کی رو سے ایسا کرنے کا کیا جواز ہوگا؟ اب طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایسے لوگ ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی تو قانونی ممانعت چاہتے ہیں' لیکن صنفِ مخالف سے آزادانہ تعلق اور اختلاط' طوائفوں سے ربط وضبط یا مستقل داشتہ رکھنے میں ان کے نزدیک کوئی ضرر اور نقصان نہیں ہے' اور نہ ہی کسی قسم کی حق تلفی ہوتی ہے۔

(۴) ''سورۃ النور کی آیت ۳۳ میں طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں' ان کو شادی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو ایک بیوی کرنے سے روکا جا سکتا ہے' تو انہی وجوہ یا ایسی ہی وجوہ کی بنا پر اُسے ایک سے زائد بیویاں کرنے سے کیوں نہیں روکا جا سکتا؟''

اس تاویل میں جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے' اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: ﴿وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ ''اور عفت مآبی سے کام لیں وہ لوگ جو نکاح کا موقع نہیں پاتے' یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔''

ان الفاظ سے اب یہ مفہوم کہاں نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں کو نکاح ہی نہیں کرنا چاہیے؟ اس میں تو صرف یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ نکاح کے ذرائع فراہم نہ کر دے' اُس وقت تک مجرد لوگ پاک باز (عفت مآب) بن کر رہیں' بدکاری میں ملوث ہو کر نفس کی تسکین نہ کرتے پھریں۔ تاہم اگر کسی نہ کسی طرح نکاح کی ممانعت کا مفہوم اس میں شامل کر بھی لیا جائے تو روئے سخن فرد کی طرف ہے' نہ کہ قوم یا ریاست کی طرف۔ یہ بات تو فرد کی اپنی صواب دید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ کب وہ اپنے آپ کو شادی کرنے کے قابل پاتا ہے اور کب نہیں۔ اور اسی کو ہدایت کی گئی ہے کہ جب تک وہ نکاح کے ذرائع نہ پائے تو نکاح نہ کرے۔ اس میں قوم یا ریاست کو یہ حق کہاں دیا گیا ہے کہ وہ فرد کے نجی معاملے میں دخل اندازی کر کے یہ قانون بنائے کہ جب تک وہ عدالت کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیوی اور چند بچوں کی پرورش کے قابل ثابت نہ کر دے' وہ نکاح نہیں کر سکتا۔ غور کریں کہ مذکورہ آیت کے کس لفظ سے اس معاملے میں ریاست کی قانون سازی کا جواز نکلتا ہے؟ اور اگر نہیں نکلتا تو پھر اس آیت کو ہی جواز بنا کر مزید پیش قدمی کرتے ہوئے ایک سے زائد بیویوں اور مقررہ تعداد سے زیادہ بچوں کے حوالے سے ریاست کو کیونکر قانون سازی کا حق دیا جا سکتا ہے؟

(۵) ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۲۹﴾ (النساء)

''اور تم ہرگز استطاعت نہیں رکھتے کہ عورتوں (بیویوں) کے درمیان عدل کر سکو' خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہش مند ہو' لہٰذا (ایک بیوی کی طرف) بالکل جھک نہ پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو۔ اور اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو' تو یقیناً اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

ان الفاظِ قرآنی کی بنیاد پر یہ عمارت کھڑی کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء میں پہلے عدل کی شرط کے ساتھ تعددِ ازدواج کی اجازت دی ہے اور پھر اسی سورت میں یہ بات خود ہی واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانوں کے بس میں نہیں ہے۔ اب یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دو یا دو سے زائد

بیویوں کے درمیان یکساں برتاؤ اور عدل نہیں ہوسکتا' لہٰذا تعددِ ازدواج کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔

سخت حیرت کی بات ہے کہ اس آیت سے اتنا بڑا مضمون اور دعویٰ کس طرح اور کہاں سے درآمد ہو گیا؟ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تو ضرور فرمایا ہے کہ انسان دو بیویوں یا زائد کے درمیان اگر پورا پورا عدل کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔ مگر کیا اس بنیاد پر تعددِ ازدواج کی وہ اجازت بھی واپس لے لی گئی ہے جو خود باری تعالیٰ نے عدل کی شرط کے ساتھ عطا کی ہے؟ آیت کے الفاظ صریحاً بتا رہے ہیں کہ اس فطری حقیقت کو صاف لفظوں میں بیان کرنے کے بعد دو یا زائد بیویوں کے شوہر سے صرف یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ایک بیوی کی طرف اس طرح ہمہ تن مائل نہ ہو جائے کہ دوسری بیوی یا بیویوں کو بالکل معلق (درمیان میں لٹکتا ہوا) ہی چھوڑ دے۔ قرآن کی رو سے پورا پورا عدل نہ کر سکنے کا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ تعددِ ازدواج کو ہی سرے سے منسوخ کر دیا جائے۔ اس کے برعکس اس کا حاصل یہ ہے کہ شوہر ازدواجی تعلق اور الفت و محبت کے لیے صرف ایک ہی بیوی کو مخصوص کر لینے سے پرہیز کرے۔ وہ ربط و تعلق اور میل جول سب بیویوں سے رکھے' خواہ اس کا دلی میلان ایک ہی کی طرف ہو۔ ریاست کو اس میں مداخلت کا موقع اس صورت میں ملتا ہے کہ جب شوہر نے دوسری بیوی یا بیویوں کو یکسر نظرانداز کر دیا ہو اور ان کے حقوق کی ادائیگی نہ ہو پا رہی ہو۔ اس صورت حال میں ہی وہ بے انصافی واقع ہوتی ہے جس کے ساتھ تعددِ ازدواج کی اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن کسی بھی منطق کی رو سے الفاظِ قرآنی اور اس کی ترکیب سے یہ گنجائش بھی نکالنا ممکن نہیں کہ معلق رکھنے کی صورت میں ایک ہی شخص کے لیے تعددِ ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھہرایا جا سکے' کجا یہ کہ اس میں سے اتنا بڑا مضمون نکال لیا جائے کہ ریاست تمام لوگوں کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا مکمل ممنوع ٹھہرا دے۔

(۶) ''سورۃ النساء کی آیت زیادہ سے زیادہ تعددِ ازدواج کو مباح ہی قرار دیتی ہے' اسے لازم تو نہیں کرتی۔ اس صورت میں اگر کوئی اسلامی حکومت یہ دیکھے کہ اس اجازت سے عام طور پر لوگ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں' اور وہ اس مباح فعل سے لوگوں کو روک دے تو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ بہت سے مباح فعل ایسے ہیں کہ جن پر حکومت پابندیاں عائد کرتی رہتی ہے اور آپ اسے دین میں مداخلت نہیں کہتے' مثلاً سڑک پر دائیں اور بائیں چلنا دونوں مباح ہیں۔ حکومت اگر یہ پابندی عائد کر دیتی ہے کہ دائیں نہ چلو' صرف بائیں چلو تو کیا یہ دین میں مداخلت ہو جائے گی؟ گوشت ہر روز کھانا مباح ہے۔ حکومت اگر کسی مصلحت سے ایک یا دو دن گوشت کھانے سے روک دیتی ہے تو اسے بھی مداخلت فی الدین کہیں گے؟ پھر آخر تعددِ ازدواج ہی ایک ایسا مباح فعل کیوں ہے کہ اس پر پابندیاں عائد کرنا دین میں مداخلت کے ہم معنی قرار پائے؟''

دیکھنے میں تو یہ تاویل بڑی معقول لگتی ہے مگر حقیقت میں یہ ایک کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ معاملات کی ایک قسم تو وہ ہے جس کے متعلق شریعت نے بالکل سکوت اختیار کیا ہے' بایں طور کہ نہ ہی ان کو منع کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کی

اجازت دی گئی ہے اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی حکم دیا گیا ہے۔ ایسے معاملات میں تو حکومت پوری طرح آزاد ہے کہ اجتماعی مصالح کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے متعلق جیسا چاہے' قانون بنائے۔ دوسری قسم کے معاملات وہ ہیں کہ جن کے متعلق قانون سازی شریعت نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور منع کرنے' اجازت دینے یا حکم دینے کی صورت میں ان کے متعلق ایک ضابطہ بنا دیا گیا ہے۔

ایسے معاملات میں کوئی حکومت اگر شریعت کے حکم کو بدل کر ممنوع کو جائز یا جائز کو ممنوع قرار دیتی ہے' تو وہ حکمِ خداوندی میں ترمیم کی مرتکب ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک نصِ صریح نے ایک فعل کو منع کیا ہے یا مباح قرار دیا ہے۔ اب اس ممانعت کو اجازت سے یا اجازت کو ممانعت سے بدلنا مداخلت فی الدین' بلکہ تحریفِ دین نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ قرآن ایک فعل کے متعلق صریحاً کہتا ہے کہ تم اسے کرنے کے مجاز ہو۔ آپ اس کے مقابلے میں کہتے ہیں کہ تم اسے کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ کیا یہ قرآن کی کھلی مخالفت نہیں ہے؟ بالکل یہی نوعیت اس صورت میں بھی ہوگی کہ جب کوئی شخص تعدّدِ ازدواج کو ممنوع قرار دینے کے بجائے اس پر وہ پابندیاں لگائے جو کہ قرآن کی لگائی ہوئی پابندیوں سے مختلف ہوں۔ قرآن اس فعل کو مباح قرار دینے کے بعد اس پر صرف دو پابندیاں لگاتا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ فرد بیک وقت چار سے زیادہ نکاح نہ کرے۔ دوسری یہ کہ جب ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے درمیان نان ونفقہ اور ازدواجی تعلقات میں مساوات اور عدل کرے۔ انہی دو پابندیوں کو اگر کوئی حکومت پوری طاقت سے نافذ کرے تو اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ بیک وقت چار کی حد سے تجاوز کرنے والوں کو سخت سزا دے سکتی ہے اور بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنے والے کو عدل پر مجبور کر سکتی ہے۔ اسی طرح جو کوئی اس معاملے میں عدل نہیں کرتا' اس پر تعزیر کا نفاذ کر سکتی ہے۔ لیکن حکومت کو یہ حق یقیناً نہیں پہنچتا کہ اس اباحت پر جو پابندیاں قرآن وحدیث نے نہیں لگائیں' وہ اپنی طرف سے لگا دے۔ جیسے قرآن نے ایک سے زائد نکاح کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ فرد کے اپنے اختیارِ تمیزی (discretion) پر چھوڑا ہے' حکومت اس اختیارِ تمیزی کو فرد کے بجائے کسی پنچایت یا عدالت کی طرف منتقل کر دے' تو یہ قانونِ قرآنی میں کھلی ترمیم ہوگی۔ قرآن یہ رائے قائم کرنے کا ذمہ دار فرد کو ٹھہراتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو عدل پر قادر پاتا ہے یا نہیں؟ حکومت اگر یہ اختیار کسی دوسرے شخص یا ادارے کو سونپتی ہے کہ نکاحِ ثانی سے پہلے وہ اس کے عدل پر قادر ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگائے' تو یہ بھی قرآن کے حکم میں ترمیم ہی ہوگی۔ قرآن پاک تعددِ ازدواج کی اباحت کو کسی ضرورت کے ساتھ مشروط نہیں کرتا۔ جو حکومت اسے خاص ضرورتوں کے ساتھ مشروط کرتی ہے اور فرد کو اس کا پابند کرتی ہے کہ نکاحِ ثانی سے پہلے کسی شخص یا ادارے کو اس بات پر مطمئن کرے کہ ان خاص ضرورتوں میں سے اسے کوئی ضرورت فی الواقع لاحق ہے' تو یہ بھی قانونِ قرآنی میں تبدیلی ہی کہلائے گی۔

تعدّدِ ازدواج کی مَن گھڑت شرائط

بعض حضرات خارجی حالات سے متاثر ہو کر تعددِ ازدواج کی اجازت صرف ان حالات تک محدود رکھنے

پر اصرار کرتے ہیں کہ جب کسی کی بیوی بانجھ ہو یا اتنی بیمار ہو کہ ازدواجی تعلق کے لائق نہ رہے یا اس طرح کی کوئی دوسری ناگزیر مجبوری لاحق ہو' لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی کھلی تردید خود نبی اکرم ﷺ کے عمل سے ہوتی ہے۔ آپؐ کے ایک سے زائد نکاح کرنے کی وجہ بیوی کا بیمار ہونا' بانجھ ہونا یا اولادِ نرینہ نہ ہونا' کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہونا' نہ تھا' بلکہ آپؐ کے تمام نکاح تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے' اصلاحِ معاشرہ کے لیے یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لیے تھے۔ اب کوئی دوسرا شخص کیسے یہ حق رکھتا ہے کہ اسلامی قانون پر اپنی طرف سے اضافی شرائط عائد کرے اور پھر یہ دعویٰ بھی کرے کہ یہ شرائط اور حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔

درحقیقت ان ساری شرائط اور حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیل ہی ہے کہ تعددِ ازدواج بذاتِ خود ایک برائی ہے۔ اسی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا کہ یہ 'فعل حرام' اگر حلال ہو بھی سکتا ہے تو صرف چند ناگزیر ضروریات کے تحت۔ اس درآمد شدہ تخیل پر اسلام کا جعلی ٹھپہ لگانے کی جتنی بھی کوشش کی جائے' قرآن وسنت اور پوری اُمت مسلمہ کا فقہی ذخیرہ اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔ مزید برآں یہ لوگ اس پر مزید دو شرائط کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔ پہلی یہ کہ آدمی کسی عدالت یا ازروئے قرآن مقرر کیے ہوئے کسی سرپنچ یا پنچایت کو اس پر مطمئن کرے کہ اسے حقیقتاً دوسری بیوی کی ضرورت ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو اس پر راضی کرے یا اس سے نکاحِ ثانی کی اجازت لے۔ یہ صریحاً اجنبی تخیلات ہیں' جنہیں اسلامی قانون میں زبردستی داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دو شرطوں کا کیا ماخذ ہے اور یہ کہاں سے درآمد کی گئی ہیں؟ کیا پوری اسلامی تاریخ میں کبھی تعددِ ازدواج کے لیے ایسی کوئی شرطیں لگائی گئی ہیں؟ کیا کوئی شہادت اس امر کی موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک کے بعد جتنی شادیاں کیں' ان میں سے کسی ایک شادی پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے انہیں اس کام پر مطمئن کیا ہو؟ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی کو دوسری شادی سے پہلے اس بات پر مجبور کیا ہو کہ وہ حضور اکرم ﷺ یا صحابہ کی کسی پنچایت کے سامنے اپنی ضرورت کو ثابت کرے۔ رہا پہلی بیوی سے اجازت لینا' تو عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان اپنے نکاح کے معاملہ میں اپنے والدین سے اجازت لینے کا تو پابند نہ ہو' لیکن بیوی سے اجازت لینا اس کے لیے ضروری ٹھہرایا جائے۔

آخری سہارا

مندرجہ بالا تمام غلط تاویلات اور من گھڑت شرائط کے بعد آخری سہارے یا ترکش کے آخری تیر کے طور پر یہ واقعہ سامنے لایا جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی کرنی چاہی تو حضور اکرم ﷺ نے ان کو اس سے روک دیا۔ اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دوسری شادی کرنا واقعی ایک بری بات ہے' اسی لیے تو حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس سے روک دیا' بلکہ اس سے بڑھ کر یہ دلیل بھی لائی جاتی ہے کہ ایک فرد کا نکاحِ ثانی اُس کی بیوی اور سسرال کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے' اسی لیے تو حضور ﷺ نے اپنی بیٹی پر سوکن کا لانا گوارا نہ کیا۔ اب اگر حضور ﷺ کی پیروی میں تمام لوگوں کو تعددِ ازدواج

سے روک دیا جائے' تو یہ سنتِ رسول کی پیروی ہوگی۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ابوجہل کا خاندان مسلمان ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس کی بیٹی (جس کا نام کسی نے جویریہ' کسی نے عوراء اور کسی نے جمیلہ بیان کیا ہے) سے نکاح کرنا چاہا۔ لڑکی کے خاندان والوں نے کہا کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی پر بیٹی نہیں دیں گے' جب تک آپؐ سے پوچھ نہ لیں۔ ایک روایت کی رو سے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آپؐ سے اشارے کنائے سے اجازت طلب کی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس بات کا چرچا سن لیا اور جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپؐ منبر پر تشریف فرما تھے:

((اَنَّ بَنِیْ هِشَامِ بْنِ الْمُغِیْرَةَ اسْتَاْذَنُوْنِیْ فِیْ اَنْ یَنْکِحُوا ابْنَتَهُمْ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ، فَلَا آذَنُ، ثُمَّ لَا آذَنُ ، ثُمَّ لَا آذَنُ، اِلَّا اَنْ یُرِیْدَ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اَنْ یُطَلِّقَ ابْنَتِی وَیَنْکِحَ ابْنَتَهُمْ، فَاِنَّمَا هِیَ بَضْعَةٌ مِنِّی یَرِیْبُنِیْ مَا اَرَابَهَا وَیُؤْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا)) (صحیح البخاری' ح: ۵۲۳۰)

''بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اس بات کی اجازت مانگی ہے کہ وہ اپنی بیٹی علی بن ابی طالب کے نکاح میں دے دیں۔ میں اس کی اجازت نہیں دیتا' نہیں دیتا' نہیں دیتا' اِلا یہ کہ ابوطالب کا بیٹا میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ میری بیٹی میرا (جگر کا) ٹکڑا ہے' جو کچھ اسے ناگوار ہوگا وہ مجھے ناگوار ہوگا اور جو چیز اسے تکلیف دے گی وہ مجھے تکلیف دے گی۔''

علی بن الحسین بن علی سے مروی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

((وَاِنِّیْ لَسْتُ اُحَرِّمُ حَلَالًا وَلَا اُحِلُّ حَرَامًا وَلٰکِنْ وَاللّٰهِ لَا تَجْتَمِعُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَبِنْتُ عَدُوِّ اللّٰهِ مَکَانًا وَّاحِدًا اَبَدًا (وفی روایة) اِنَّ فَاطِمَةَ مِنِّیْ وَاِنِّیْ اَتَخَوَّفُ اَنْ تُفْتَنَ فِیْ دِیْنِهَا)) (صحیح مسلم' ح: ۲۴۴۹)

''میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا۔ مگر اللہ کی قسم! اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں (ایک دوسری روایت میں ہے کہ) فاطمہ مجھ سے ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ اپنے دین کے معاملہ میں کہیں فتنے میں نہ پڑ جائے۔''

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بہت سی شادیاں کیں اور مسلمانوں کو بھی بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی' مگر خود اپنی بیٹی پر ایک سوکن کا آنا بھی گوارا نہ کیا۔ سوکن کے آنے سے جو اذیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو اور بیٹی کی وجہ سے آپؐ کو ہوسکتی تھی' وہی اذیت دوسری عورتوں اور ان کے ماں باپ کو بھی تو لاحق ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپؐ نے اپنے حق میں تو اسے برداشت نہ کیا اور دوسروں کے حق میں اجازت دے کر اسے جائز رکھا؟ بظاہر یہ ایک سخت اعتراض بنتا ہے اور معاملے کی سادہ صورت دیکھ کر آدمی ایک مرتبہ بڑی الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو بات کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔

اب دیکھئے کہ اس معاملے میں کیا پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہے۔ شرعاً حضور ﷺ کی بیٹی پر سوکن لانا آپؐ کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے حلال تھا' اسی وجہ سے انہوں نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ فعل حرام ہے۔ خود ہی تصریح فرما دی کہ میں حلال کو حرام نہیں کر سکتا۔ یہاں دراصل حضور ﷺ کی ایک ہی شخصیت میں دو مختلف حیثیتیں جمع تھیں۔ پہلی حیثیت میں آپؐ انسان بھی تھے اور فطری طور پر یہ ممکن نہ تھا کہ آپؐ کی صاحبزادی کے گھر میں سوکن آنے سے جو بشری تلخی پیدا ہو' اس کا تھوڑا یا زیادہ اثر آپؐ کی طبیعت پر نہ پڑے۔ دوسری حیثیت میں آپؐ اللہ کے رسول تھے اور اس حیثیت سے آپؐ کا یہ مقام تھا کہ اگر کسی شخص سے آپ کے تعلقات بگڑ جائیں اور وہ آپ کے لیے موجب اذیت بن جائے تو پھر اس صورت میں اُس کے دین و ایمان کی خیر نہیں۔ اسی بنا پر حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنی ہشام بن مغیرہ کو بھی اس نکاح سے روک دیا۔ اگرچہ شرعاً یہ حلال تھا' مگر اس کے کرنے سے یہ اندیشہ تھا کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی دوسری بیوی اور اس کے خاندان کا ایمان اور عاقبت دونوں خطرے میں نہ پڑ جائیں۔

ایک اور بات جس کا حضور ﷺ نے اپنے خطبے میں ذکر فرمایا' وہ یہ تھی کہ بنی ہشام بن مغیرہ اسلام اور حضور ﷺ کے بدترین دشمن رہ چکے تھے اور فتح مکہ کے بعد تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے۔ خود اس لڑکی کا باپ ابوجہل تو اسلام اور حضور ﷺ کی دشمنی میں سب کفار سے بازی لے گیا تھا۔ غزوۂ بدر میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا اور برسوں اس کا خاندان جذبہ انتقام میں تڑپتا رہا۔ اگرچہ یہ لوگ اب اسلام قبول کر چکے تھے' لیکن خلوص اور قلوب کا امتحان ابھی باقی تھا۔ ان حالات میں ابوجہل کی بیٹی کا اس گھر میں پہنچ کر سوکن بن جانا بڑے فتنوں کا باعث بن سکتا تھا' جہاں حضور ﷺ کی بیٹی گھر کی ملکہ کی حیثیت سے موجود تھی۔ ان لوگوں کی تالیفِ قلوب تو کی گئی' لیکن اس مرحلہ پر انہیں عین خاندانِ نبوت میں داخل کرنا اور نبی کی بیٹی کے بالمقابل کھڑا کر دینا' کسی طور پر مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسی بنا پر حضور ﷺ نے اس رشتے کو ناپسند فرمایا اور علانیہ طور پر کہا کہ خدا کے رسول کی بیٹی اور خدا کے دشمن کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس بات کی طرف بھی آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ اس سے (حضرت) فاطمہؓ کے فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ گویا ایک فرد کو اپنے ذاتی معاملے میں بھی اس طرح کی آزادی نہیں دی جا سکتی جس سے دوسرے مسلمانوں کے لیے فتنہ و شر کا خطرہ پیدا ہو رہا ہو۔

تعدّدِ ازدواج ایک فطری ضرورت

صاحبِ ''معارف القرآن'' کے مطابق مرد کے لیے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا اسلام سے قبل دوسرے مذاہب میں جائز اور درست سمجھا جاتا تھا۔ عرب' ہندوستان' ایران' مصر' بابل وغیرہ ہر قوم میں تعددِ ازدواج کا طریقہ رائج تھا۔ اس کی فطری ضروریات سے انکار آج بھی آسان نہیں۔ دورِ حاضر میں اپنے متقدمین کے خلاف مغرب نے تعدد ازدواج کو ناجائز قرار دیا' تو اس کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں اور باہمی شادی کے بغیر بچے پیدا کرنے کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس کے قبیح نتائج کی بنا پر آج وہاں کے بہت سے اہلِ دانش تعددِ ازدواج

کے حق میں اپنی آراء کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایک مشہور عیسائی فاضل ڈیون پورٹ اس کے حق میں انجیل کی بہت سی آیات نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: ''ان آیتوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ تعددِ ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں' بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے''۔ پادری نکسن' جان ملٹن اور ایزک ٹیلر نے بھی پرزور الفاظ میں تعدد ازدواج کی تائید کی ہے۔ ہندوؤں کی ویدوں سے بھی تعددِ ازدواج کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی' بلکہ اس سے دس دس' تیرہ تیرہ اور ستائیس ستائیس بیویوں کو بیک وقت رکھنے کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ ہندومت کے بڑے دیوتا کرشن کی طرف سینکڑوں بیویوں کی نسبت کی جاتی ہے۔ جو بھی مذہب اور قانون عفت وعصمت کو قائم رکھنا اور زناکاری کا انسداد لازمی سمجھتا ہے' تو اسے تعددِ ازدواج کی اجازت دیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ زناکاری کا بھی علاج ہے اور مردوں کی نسبت عورتوں کی کثرت کے مسئلے کا حل بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ مغربی اقوام ہی کو دیکھ لیں' تعددِ ازدواج کی تو ان کے ہاں پابندی ہے اور ناجائز تعلق جتنی بھی عورتوں سے قائم کر لیا جائے' اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ اسی بنا پر ان معاشروں میں داشتہ اور کسبی عورتوں کی افراط ہے۔

قبل از اسلام تعددِ ازدواج بغیر کسی پابندی اور حد بندی کے رائج تھی۔ یہود و نصاریٰ' ہندوؤں' آریاؤں اور پارسیوں وغیرہ' کسی کے ہاں بھی اس پر کوئی ضابطہ لاگو نہ تھا۔ ابتدائے اسلام میں بھی یہ رسم بغیر کسی تحدید کے جاری رہی۔ لیکن اس غیر محدود کثرتِ ازدواج کا نتیجہ یہ تھا کہ پہلے تو لوگ حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے' پھر بعد میں بیویوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہ کر پاتے۔ یہ منکوحہ عورتیں ان کے ہاں قیدی کی سی زندگی گزار رہی ہوتیں۔ ان کے درمیان عدل و مساوات کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ جس سے زیادہ محبت اور دل بستگی ہوتی اسے تو نوازا جاتا' اور جس سے دل بھرا اور رخ پھر گیا اس کی پھر کوئی خیر خبر نہیں۔ اسلام نے معاشرے کے اس ظلم عظیم کی روک تھام کی' تعدد ازدواج کی حد مقرر کی اور منکوحہ عورتوں کے درمیان عدل و مساوات کا نہایت تاکیدی اور بنیادی حکم دیا اور اس حکم کی خلاف ورزی پر بھی شدید وعید سنائی۔ (۲)

تعددِ ازدواج کی حکمت

تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کی روشنی میں اب تعددِ ازدواج کی حکمت اور مصلحت پر کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ (۳)

ظہور اسلام کے دور میں لوگوں کے ہاں دس یا اس سے بھی زیادہ بیویاں ہوا کرتی تھیں اور کوئی حتمی تعداد مقرر نہ تھی۔ ان حالات میں اسلام نے تعداد پر پابندی عائد کی اور بیک وقت چار سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مزید ایک پابندی یہ بتائی کہ ان چار تک کی بھی تبھی اجازت ہے جبکہ تم ان کے درمیان عدل و انصاف کر سکو۔ ورنہ ایک پر ہی اکتفا کیا جائے اور آگے نہ بڑھا جائے۔ گویا اسلام نے تعددِ ازدواج کی نہیں بلکہ تحدیدِ ازدواج کی اجازت دی ہے۔ اس کو بھی مرد کی خواہش نفس پر نہیں چھوڑا' بلکہ عدل و انصاف سے مشروط کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام نے تعددِ ازدواج کی اجازت کیوں دی؟ اسلامی نظامِ زندگی تمام انسانوں کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور اس کے حالات و ضروریات کے مطابق ہے۔ وہ لوگوں کی حاجات سے

آنکھیں بند نہیں کرتا اور نہ ہی مختلف طبائع کے انسانوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر مسئلہ تعددِ ازدواج پر غور کریں تو درج ذیل نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں:

پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر گزشتہ اور موجودہ معاشروں میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ عورتوں کی زیادتی کی نسبت ۱:۴ سے زیادہ کبھی نہیں رہی' بلکہ اس کے درمیان ہی رہی ہے۔ ایسی صورتِ حال کا آخر کیا علاج ہے؟ کیا محض شانے ہلا کر اس صورت حال سے لاتعلق ہو جائیں' حالات کے دھارے کو اپنا رخ خود متعین کرنے دیں اور پیش آمدہ صورت حال کو قبول کر لیں؟ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کی سوچ ہی ایسی ہو' لیکن نسلِ انسانی کو محترم سمجھنے والی ایک سنجیدہ شخصیت کے لیے یہ موقف قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی ایسا ضابطہ ہو' جس کی مدد سے اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا جائے۔

غور و فکر سے اس مسئلے کے تین ممکنہ حل نکلتے ہیں:

(ا) شادی کے قابل ہر شخص شادی کے قابل کسی ایک عورت سے شادی کرے۔ اس کے علاوہ جو عورتیں رہتی ہیں' ان کو یونہی خاوند کے بغیر معاشرے میں چھوڑ دیا جائے اور نتائج سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔

(ب) شادی کے قابل ہر مرد شادی کے قابل ایک عورت سے قانونی نکاح کرے اور خاوند کے بغیر جو دوسری عورتیں ہیں' ان سے ناجائز تعلقات قائم کرتے ہوئے گناہوں بھری زندگی بسر کرے۔

(ج) شادی کے قابل مرد شادی کے قابل ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرے اور ان کے پورے حقوق ادا کرے۔ اس طرح جائز تعلقات قائم کر کے مرد ناجائز تعلقات اور حرام کاری سے بچے اور یوں وہ روشن زندگی بسر کرے۔

اب ذرا غور کریں کہ پہلی صورت تو بالکل خلافِ فطرت ہے۔ ایک عورت کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ ساری زندگی تنہا بغیر خاوند کے صحیح طور پر بسر کر سکے۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ عورت محنت اور مزدوری کر کے مرد سے مستغنی ہوسکتی ہے۔ ایسے سطحی اور غیر سنجیدہ لوگ حقیقت سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ عورت محنت مزدوری کے بعد بھی اپنے فطری تقاضے اور ضرورت سے بالکل مستغنی نہیں ہوسکتی۔

دوسری صورت اسلام کے پاکیزہ رجحانات کے بالکل متضاد ہے اور اسلام کے معاشرتی نظام میں اس کی کوئی جگہ نہیں بنتی۔ یہ تو معاشرے میں کھلم کھلا فحاشی اور بدکاری پھیلانے والی بات ہے۔ اس کو ماننے والے اللہ تعالیٰ کے حکم کا کھلم کھلا استہزاء کر کے دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں کھیلتے ہیں۔ یوں انسانی معاشرے میں بھی عفت و عصمت اور حیا بالکل پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور نہ ہی بچے کے نسب کی حفاظت ممکن ہے۔ کیا ان باتوں اور کاموں کے مغربی معاشرہ پر اثرات اور تباہ کن نتائج ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

رہ گئی صرف تیسری صورت' جسے اسلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام نے نہ صرف تعددِ ازدواج کی اجازت دی ہے بلکہ اس پر شرعی حدود و قیود بھی عائد کی ہیں اور یہی مذکورہ مسئلے کا مثبت اور تعمیری حل ہے۔ اسی سے پاکیزہ

معاشرے کی تعمیر میں مثبت مدد ملتی ہے۔ نیز فحاشی اور بدکاری کی دلدل میں پھنسنے سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انسانی معاشرہ' قدیم ہو یا جدید' اس میں ایک اور صورت حال کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی صرفِ نظر' کہ مرد میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ستّر سال یا اس سے بھی اوپر ہوتی ہے' جبکہ عورت میں یہ صلاحیت عمومی طور پر لگ بھگ پچاس سال کی عمر میں (تقریباً) ختم ہو جاتی ہے۔ گویا زوجین کے درمیان ایک ایسا وقت اکثر آ جاتا ہے جس میں مرد تو بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی خواہش بھی ہوتی ہے جبکہ عورت اس حوالے سے ختم ہو چکی ہوتی ہے اور اس کی خواہش بھی مردہ ہو جاتی ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ عورت اور مرد کو الگ الگ پیدا کرنے کا مقصد افزائش نسل ہے اور اس کا انتظام آبادی کے پھیلاؤ اور اس کی کثرت سے کیا گیا ہے۔ اس کا حل شریعت اسلامی میں دی گئی اجازت سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تعددِ ازدواج کو لازم نہیں کیا گیا' بلکہ حالات و واقعات کے مطابق شرعی حدود و قیود کے اندر اس کی اجازت دی گئی ہے اور خلاف ورزی کرنے والے کے لیے سخت وعیدیں ہیں۔ پھر بعض اوقات کبرسنی یا کسی بیماری کی بنا پر عورت بچے پیدا کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے یا ویسے بانجھ ہو جاتی ہے۔ اب مرد جوان ہو اور اولاد کی خواہش بھی توانا ہو' تو اس کو بوڑھی اور بیمار عورت کے ساتھ زبردستی ساری زندگی گزارنے پر مجبور کرنا بھی تو زیادتی ہوگی۔ زندگی کی مشکلات حقیقی ہوتی ہیں اور ان کا حل بھی حقیقت پسندی سے ہی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

اس مسئلے کو بھی تین ممکنہ طریقوں سے حل کیا جا سکتا ہے:

(ا) مرد پر پابندی عائد کر دی جائے کہ وہ پچاس سال کے بعد وظیفہ زوجیت کی ادائیگی بند کر دے اور اسے کہہ دیا جائے کہ یہ بات تمہاری منکوحہ کے احترام اور حقوق کے منافی ہے۔

(ب) ایسے مرد کو اس بات پر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ مزید عورتوں سے نکاح کرنے کے بجائے عورتوں سے آزادانہ دوستیاں گانٹھتا پھرے۔

(ج) اسے اس بات کی اجازت دی جائے کہ شرعی حدود کے اندر وہ اپنی ضرورت کے مطابق ایک سے زائد بیویاں رکھ سکے۔ اس صورت میں پہلی بیوی کو بھی بغیر طلاق دیے رکھا جا سکتا ہے۔

پہلی صورت انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ تجرد کی زندگی برداشت کرنا بہت مشکل ہے اور قانوناً اس پابندی سے عائلی زندگی جہنم بن سکتی ہے' جو اسلام کی منشا کے خلاف ہے۔

دوسری صورت اسلامی قوانین اور اخلاقیات کے منافی ہے اور یہ انسان کو حیوان بنانے کے مترادف ہے۔

اب تیسری صورت ہی ایسی ہے جو کہ انسانی فطرت اور اس کی ضروریات کے مطابق ہے۔ اس طریقے سے پہلی بیوی کے حقوق بھی محفوظ رہتے ہیں اور وہ طلاق سے بھی بچ جاتی ہے۔ نیز مرد بھی اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق شرعی اصولوں کے اندر رہ کر اپنی زندگی خوشگوار بنا سکتا ہے۔ ہم جتنا ان مسائل پر غور کرتے جائیں' اللہ تعالیٰ کے احکامات کی حکمتیں ہم پر واضح ہوتی جاتی ہیں۔

جو شخص بھی شرعی ضوابط کی روح اور اس کی حکمت عملی کو سمجھتا ہے' وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام میں تعددِ ازدواج بذاتہٖ مطلوب ہے اور انسانی ضروریات کے بغیر جائز ہے۔ یہ کوئی حیوانی لذتیت نہیں کہ ایک سے دل بھر گیا تو خواہ مخواہ اب دوسری سے لطف اندوزی شروع کر دی۔ تعددِ ازدواج کو بعض حقیقی فطری اور معاشرتی مسائل پر قابو پانے کے لیے جائز کیا گیا ہے اور یہ صورت حال ہر زمانے کے معاشرے میں پیش آ جاتی ہے۔ اب اگر بعض ادوار میں اس رخصت اور اجازت کا غلط فائدہ اٹھایا گیا' اور بیویوں کو اس طرح بدلنا شروع کر دیا جس طرح کہ دوستوں کو بھی نہیں بدلا جاتا' تو اس صورت حال کا اسلام قطعاً ذمہ دار نہیں اور نہ ہی اس قسم کے عیاش اور اوباش لوگ اسلام کے حقیقی نمائندے ہو سکتے ہیں۔ ان کی نہ تو صحیح اسلامی معاشرے میں سکونت تھی اور نہ ہی انہیں اسلامی احکامات کا فہم حاصل تھا۔ ایسے معاشرے ہی ان محلات اور حریموں کے ذمہ دار تھے جو انتہائی گھٹیا انداز سے وجود میں آئے۔ شریعت اسلامی سے نابلد یہی جاہل اور عیاش حکمران تھے جنہوں نے اسلام کی بہت غلط تصویر کشی کی۔ اس سب کا علاج اسلامی نظریہ حیات اور احکامات وضوابط پر مکمل طور پر عمل پیرا ہونے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے' آمین!

تعدّدِ ازدواج سے متعلق غور طلب حقائق

بقول صاحب ''ضیاء القران'' تعددِ ازدواج کے بارے میں مختصراً چند حقائق کو پیش نظر رکھنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ (۴)

(۱) یہ حکم نہیں کہ جس کی پیروی ہر مسلمان پر لازم ہو' بلکہ ایک رخصت ہے۔

(۲) یہ رخصت بھی قید وشرط کے بغیر نہیں' بلکہ سخت قیود سے مشروط ہے۔

(۳) طب اس پر متفق ہے کہ مرد کی طبعی کیفیت عورت کی طبعی کیفیت سے جدا ہے۔

(۴) مرد میں جنسی رغبت عورت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ جنسی عمل کے بعد عورت کو مدتِ دراز تک مختلف نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ استقرارِ حمل' وضع حمل' رضاعت اور بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے تمام مراحل اسے مکمل مشغول رکھتے ہیں۔ اس دوران اسے صنف مخالف کی طلب کم ہی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مرد ان تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے اور اس میں طلب موجود رہتی ہے۔

(۵) اکثر ممالک میں عورت کی شرح پیدائش مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ جہاد اور جنگ میں بے شمار مرد کام آتے ہیں۔ اس سے عورتوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

(۶) تاریخِ انسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اکثر معاشروں کے قانونی نظام میں تعددِ ازدواج ممنوع ہے اور زنا کی کھلی اجازت ہے۔ اور پھر اس فعل کو اپنی اَن گنت خرابیوں کے باوجود جرم ہی تصور نہیں کیا جاتا۔

(۷) یہ بھی سوچنے کا مقام ہے کہ ایک عورت کے لیے اس کے خاوند کی دوسری بیوی قابلِ برداشت ہے یا پھر اس کی داشتہ' جس کے لیے کوئی قاعدہ قانون ہی نہ ہو؟

(۸) اسی طرح کسی باحمیت اور باغیرت عورت کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ گھر کی مالکہ بن کر رہے اور اس کا خاوند اس کے تمام حقوق کا ذمہ دار ہو' اس کی اولاد جائز متصور ہو اور معاشرہ میں اسے باعزت مقام حاصل ہو' یا پھر وہ ایک ایسی عورت کے روپ میں رہے جس کا حسن و شباب اسے ہوسناک نگاہوں کا کھلونا بنائے رکھے' اس کی کوئی عزت اور حقوق نہ ہوں' نہ کوئی اس کی اولاد کا باپ بننا گوارا کرے اور نہ ہی کوئی اس کی ذمہ داری لینے کو تیار ہو؟

(۹) کیا مغربی ممالک اپنی تمام تر ترقی کے باوجود حرامی بچوں اور کنواری ماؤں کی تعداد میں ہر روز بڑھتے ہوئے اضافے سے پریشان نہیں؟

ان تمام حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے ہم پیش آمدہ مشکلات سے بچیں' جن کا حل پیش کرتے ہوئے اسلام نے مخصوص شرائط کے ساتھ ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اب تو کئی مغربی مفکر بھی اسی حل کو صحیح تصور کر رہے ہیں۔

اگر ہم حقیقت پسندی سے کام لیں تو لازماً اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اس رخصت کا اکثر و بیشتر ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ معدودے چند افراد چھوڑ کر اکثر و بیشتر دوسری شادی ہوس روانی اور لذت طلبی کے لیے کرتے ہیں۔ متاعِ ہوش و عقل نئی بیوی کے حضور یوں لٹا دی جاتی ہے کہ پہلی بیوی بیوہ اور اس کی اولاد یتیم بن کر رہ جاتی ہے۔ ان کے نان و نفقہ اور دیگر ضروریات کو بالکل طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ذرا غور و فکر سے کام لیں اور انصاف کریں کہ کیا یہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے اور یہی اسلامی تعلیمات ہیں؟ وہاں تو صریحاً اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ایک سے زیادہ کی اجازت صرف اس صورت میں ہے کہ اگر تم باہمی عدل کر سکو۔ گویا ایسے مسلمان خود اپنی بدعملیوں سے اپنے دین کو داغدار کر رہے ہیں اور دوسروں کو اسلام سے متنفر کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) مسئلہ تعددِ ازدواج از ابوالاعلیٰ مودودی' اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' مطبوعہ ۱۹۷۴ء (بار سوم)

(۲) تفسیر معارف القرآن' از مفتی محمد شفیعؒ' جلد دوم' پارہ ۴' سورۃ النساء' آیت ۳' ص ۸۵ تا ۸۷' طبع ۲۰۱۵ء۔

(۳) فی ظلال القرآن از سید قطب شہید' مترجم سید معروف شاہ شیرازی' جلد اول' پارہ ۴' سورۃ النساء' آیت ۳' طبع ادارہ منشورات اسلامی' ملتان روڈ لاہور' طبع چہارم' ۱۹۸۸ء (صفحہ ۹۰۹ تا ۹۱۹)

(۴) ضیاء القرآن از پیر محمد کرم شاہ الازہری ج ۱' سورۃ النساء' آیت ۳' صفحہ ۳۱۶ تا ۳۱۸' طبع پنجم' طبع ۱۴۰۲ھ' ضیاء القرآن پبلی کیشنز' لاہور

مہکتے بَرگد

جناب ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے انتہائی معتمد اور دیرینہ ساتھی
ملک خورشید احمد صاحب کی یاد میں

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر عمران وحید ☆

اُمتِ مسلمہ میں ہر دور میں ایسے علماء اور مفسّرین پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں' لیکن برصغیر پاک و ہند میں بعض علماء کی طرف سے یہ تاثر دیا جاتا رہا ہے کہ قرآن پڑھنا اور اس کے مفاہیم اور مطالب میں غور و فکر کرنا دراصل علماء کا کام ہے اور عوام الناس کو براہِ راست قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے لازمی طور پر کسی نہ کسی عالم سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ مزید یہ کہ بعض علماء نے ایک عام آدمی پر قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کے لیے پندرہ علوم کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہے کہ ان کے بغیر قرآن کو سمجھنا ناممکن ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مَن مانی تاویلیں کر کے انسان گمراہ ہو سکتا ہے۔ متشابہات القرآن کی حد تک تو یہ بات کسی حد تک تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن قرآن کے اوامر و نواہی اور اس کے آفاقی پیغام کو سمجھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک عامی مسلمان' جو اردو زبان سے واقفیت رکھتا ہو' پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا اردو ترجمہ خود پڑھے اور اس میں غور و فکر بھی کرے تاکہ وہ جان سکے کہ اللہ مالک الملک نے اپنے کلام میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جہاں مشکل مقامات آئیں تو وہاں کسی عالمِ دین سے راہنمائی لے لیں' لیکن قرآن کا سادہ اردو ترجمہ پڑھنا اور سیکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور اس کے لیے کسی استاد کی ضرورت نہیں۔

یہ تھی وہ فکر اور سوچ جس کو لے کر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ میدان میں آئے اور قرآن کا خادم ہونے کا حقیقی معنوں میں حق ادا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار ان خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے جو اپنے لگائے ہوئے پودوں کو قد آور درخت بنتے اور پھلوں سے لبریز ہوتے ہوئے خود اپنی زندگی میں دیکھ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بغیر کسی مسلکی تعصب کے قرآن مجید کے ترجمہ اور مختصر تفسیر کا جو کارنامہ انجام دیا اس کے باعث قرآن حکیم کا ترجمہ و مختصر تفسیر نہ صرف اردو بلکہ انگریزی زبان میں ویڈیو سی ڈیز کی شکل میں تمام دنیا میں پھیل گیا۔ میرا ذاتی موقف یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان سارا سال نہ سہی صرف رمضان کے مہینے میں ہی ڈاکٹر صاحب کا ''بیان القرآن'' آڈیو یا ویڈیو دو اڑھائی گھنٹہ روزانہ سن لے تو' ان شاء اللہ' وہ ختم قرآن کی سعادت بھی حاصل کر لے گا اور اس کی قرآن کے بنیادی پیغام تک اتنی رسائی حاصل ہو جائے گی کہ وہ قرآن حکیم کو سمجھ کر اس پر عمل کر سکے گا۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم زیرِ نظر مضمون کی طرف آتے ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کے دیرینہ دوست ملک خورشید احمد صاحب کے بارے میں ہے۔ یہ صاحب ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے بھتیجے اور میرے ماموں تھے۔ ان کے ساتھ ہی میری ڈاکٹر صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب' ڈاکٹر رفیع الدین اور علامہ اقبال سے بے حد متاثر

☆ اسسٹنٹ پروفیسر کارڈیالوجی' پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی' لاہور

تھے اور اپنی کتابوں اور تقاریر میں ان کے حوالہ جات کثرت سے دیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب ملک خورشید احمد صاحب کا نہ صرف بے حد احترام کرتے تھے بلکہ ان سے مشاورت بھی کرتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ ڈاکٹر صاحب کی وفات تک جاری رہا۔ ملک صاحب کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہستی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تھی اور مجھے دینی علوم کی طرف ملک صاحب نے مائل کیا' گویا میرا قرآن وحدیث کی طرف آنا بھی دراصل ڈاکٹر صاحب ہی کی شخصیت اور تعلیم کے باعث تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی میرے ساتھ خصوصی محبت ڈاکٹر رفیع الدین کا نواسہ ہونے کے باعث تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف ڈاکٹر رفیع الدین کے حوالے سے کرایا تو وہ بے حد شفقت سے پیش آئے اور میرا ہاتھ چوم لیا۔

آیئے اب اس ہستی کے حالات کا مطالعہ کریں جس کے بارے میں یہ مضمون ان کی وفات پر لکھا گیا تھا۔ اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب کی کتب سے بھی راہنمائی لی گئی ہے جس میں ملک صاحب کا تذکرہ موجود ہے۔

لوگ یا تو اپنی عبادت گزاری اور زہد وتقویٰ کی بنیاد پر یا پھر خدمت خلق کے باعث موت کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقوق العباد اور حقوق اللہ کے معاملہ میں ایسا رویہ رکھیں کہ ان کی موت سے نہ صرف دنیا ایک متقی انسان سے محروم ہو جائے بلکہ لوگوں کے دلوں میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی یاد باقی رہ جائے۔ زیر نظر مضمون ایک ایسے ہی خادمِ خلق اور ولی اللہ ملک خورشید احمد صاحب کی زندگی کی روداد ہے جس نے اپنی زندگی اللہ کی عبادت اور دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ یہ تحریر مرحوم کی وفات پر لکھی گئی تھی اور آج ان کی وفات کے ساڑھے تین سال بعد قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا اور دین ساتھ ساتھ کس طرح زندگی کا معمول بن سکتے ہیں۔

رات کے سات بجے ہیں اور میں ساہیوال کے علاقے کوٹ الٰہ دین نمبر ۲ میں ۱۷ مارچ کا سارا دن گزارنے کے بعد تیز رفتار سے سڑک پر دوڑتی ہوئی اپنی کار میں لاہور جا رہا ہوں۔ مطلع ابر آلود ہے اور اندھیرا چھا جانے کے باوجود سفید بادل آسمان پر پھیل چکے ہیں۔ میں کار کا شیشہ کھول کر بادلوں میں گھور رہا ہوں اور اُس کو تلاش کر رہا ہوں جس کو آج اپنے ہی ہاتھوں سے منوں مٹی تلے دفنا آیا ہوں۔ بادلوں کی اوٹ سے چاند بھی گاہے گاہے جھانکتا ہے اور میری اُمید بھری نگاہیں اُن دو آنکھوں کو تلاش کر رہی ہیں جن سے ہمیشہ مجھ پر محبتیں اور شفقتیں برستی رہی تھیں۔ بہت دیر تک بادلوں اور چاند کی آنکھ مچولی میں اُس ہستی کو تلاش کرنے کے بعد اچانک گاڑی کا ہارن بجنے سے جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میری یہ تلاش عبث اور نا تمام ہی رہے گی' اور اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں شاد عظیم آبادی کے شعر کا پہلا مصرعہ گونجنے لگا ع ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں' ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم!

میں یہ تو نہیں جانتا کہ لوگ اپنی یا اُن کے مرنے کے بعد دوسرے اُن کی سوانح عمری اور حالاتِ زندگی کیوں لکھا کرتے ہیں' لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اکثر اوقات یہ معاملہ ایسے افراد کے ساتھ ہی پیش آتا ہے جو کوئی بڑا کارنامہ انجام دے جائیں یا پھر کسی بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن افراد کی سوانح حیات اور زندگی کی روداد قلمبند نہیں کی جاتی کیا وہ واقعی اِس لائق نہیں ہوتے یا پھر ہمارے معاشرے میں ایسے عظیم لوگ ہمیشہ گمنام ہی رہ جاتے ہیں' کیونکہ وہ کسی ایسے مقصد کی خاطر زندگی گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتے ہیں جو مادہ پرستی میں گھری ہوئی اس دنیا کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا۔ آج جس ہستی کا تذکرہ ہم کرنے جا رہے ہیں وہ واقعی ایک خادمِ خلق' پیکر محبت ووفا' صابر وشاکر اور نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔

حالاتِ زندگی

ملک خورشید احمد صاحب ۱۹۲۳ء میں کوٹلی لوہاراں مشرقی، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محترم کا نام پروفیسر نصیر الدین تھا جو معروف فلاسفر اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین کے بھائی تھے۔ پروفیسر نصیر الدین مرے کالج سیالکوٹ میں پروفیسر تھے۔ ملک خورشید صاحب نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی اور بعد ازاں اپنے والد کے ہمراہ ریاست جموں (ہندوستان) چلے گئے جہاں تقسیم ہند تک قیام کیا۔ جموں کے قیام کی یادیں اُن کی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ تھیں اور راقم الحروف کو وہ اکثر وہاں کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ جموں میں اپنے قیام کے دوران ہی ملک خورشید صاحب نے پرنس آف ویلز کالج جموں سے گریجویشن کیا۔ اُس دور میں اُن کے کلاس فیلوز میں معروف بیوروکریٹ جناب قدرت اللہ شہاب شامل ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجر ہو کر اپنے والدین کے ساتھ سیالکوٹ آ گئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔ ملک خورشید صاحب کو سیالکوٹ آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اُس وقت کے گورنمنٹ کالج منٹگمری (موجودہ ساہیوال شہر) میں لائبریرین کی ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں تمام عمر یہیں بسر کر کے ۱۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو ساہیوال ہی میں وفات پائی۔ یہ ایک بہت طویل قیام تھا جس کے اُن کی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ آپ نے ایم اے لائبریری سائنس بھی کر لیا تھا اور آپ نے یہ تعلیم بڑی مشقت اور تگ و دو سے حاصل کی تھی۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے کالج میگزین (ساہیوال) کے گولڈن جوبلی نمبر میں شائع ہونے والے ملک خورشید احمد صاحب کے ایک خودنوشت مضمون ''میری چند یادداشتیں'' میں ملک صاحب لکھتے ہیں:

> ''جموں ریاست کشمیر کے ایک خوبصورت شہر سے ہجرت کے بعد سیالکوٹ پہنچا۔ لاہور سول سروس اکیڈمی کی تین سال ملازمت کے بعد گورنمنٹ کالج منٹگمری میں بطور لائبریرین تعیناتی ہوئی۔ چونکہ یہ اپنی پسند کا شعبہ تھا' بڑی خوشی سے سفر کی تیاری شروع کی۔ ۲۶ مئی ۱۹۵۲ء کو عازمِ منٹگمری ہوا۔ ٹرین اور بس کا سفر پانچ سے سات گھنٹے کا ہوا کرتا تھا اور بہت کم سواری دستیاب ہوتی تھی۔''

ملک صاحب بطورِ خادمِ خلق

ملک خورشید احمد صاحب کا تذکرہ کسی عام انسان کا ذکر نہیں بلکہ ایک نابغۂ روزگار' خدا ترس اور شفیق انسان کی روداد ہے' جس کو عوام الناس کے لیے بیان کرنا اُن سے نہ صرف میری محبت کا تقاضا ہے بلکہ یہ مجھ پر اُن کا بہت بڑا قرض ہے۔ راقم الحروف کو وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ: ''میرا کوئی بیٹا نہیں ہے' تم ہی میرے بیٹے ہو''۔ اِس لیے اُن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا جائزہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ خدمت خلق اور زہد و عبادت کے اِس عظیم پیکر کے حالات پڑھ کر لوگ اپنی اصلاح بھی کر لیں اور ایک بے لوث اور مخلص انسان سے آشنا بھی ہو جائیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جس کی ایک ایک سانس غرباء' مساکین' حاجت مندوں اور بے سہارا لوگوں کے لیے وقف تھی۔ کوئی بھوکا ہو' بیمار ہو' مجبور ہو یا پھر لاچار اور پریشان ہو' ساہیوال کے کوٹ الٰہ دین نمبر ۲ میں اُن کا گھر اُس کے لیے بے حسی اور خود غرضی کی اِس اندھیری رات میں مدد کی امید کا ایک روشن مینار تھا جس کی روشنی دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ ضرورت مند پروانوں کی طرح اِس شمع کی کرنوں پر ٹوٹ پڑتے تھے اور اپنا مقصد حاصل کر لیا کرتے تھے۔ کیا عجیب بات تھی کہ اُن کے اپنے مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے اور نہ ہی ان کی زندگی کسی قسم کے ناز و نعم سے عبارت تھی۔ سادہ غذا اور لباس' نہ کوئی گلہ اور نہ شکوہ۔ جو مل گیا اُسی کو مقدر سمجھ لیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اِس کے باوجود اُن کے پاس مخیّر حضرات کے دیے ہوئے لاکھوں روپے ہوتے تھے جو لوگ اُنہیں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے بھیجا کرتے تھے اور پورے اعتبار

اور اعتماد کے ساتھ اُن کے حوالے کیا کرتے تھے‘ کیونکہ وہ بخوبی یہ بات جانتے تھے کہ اُن کی یہ رقم مستحق افراد میں تقسیم ہو گی۔ ملک خورشید احمد صاحب کے پاس جو لاکھوں روپے صدقات‘ زکوٰۃ وغیرہ کی مد میں جمع ہوتے تھے‘ وہ اُنہیں ایک نہایت مربوط اور منظّم شیڈیول کے مطابق ماہانہ بنیادوں پر مستحق‘ نادار اور بے سہارا انسانوں میں تقسیم کرتے اور اِس کا مکمل ریکارڈ ایک ڈائری میں رکھا کرتے تھے۔ اُن کی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ یہ لاکھوں روپے زیادہ سے زیادہ محتاجوں کی مدد کے لیے استعمال کیے جائیں‘ نہ کہ کسی ایک شخص کو بہت سی رقم دے کر باقیوں کو محروم کر دیا جائے۔ کسی کو آٹا‘ گندم‘ چاول‘ اناج ماہانہ بنیادوں پر فراہم کیا جاتا اور کسی کی دکان میں سودا ڈلواتے‘ بیماروں کو خود ادویات خرید کر دیتے اور نادار مریضوں کے علاج کے لیے خود جاتے یا فون پر ڈاکٹروں سے رابطہ کرتے اور ہسپتالوں میں بھیجنے سے پہلے مریض کو اپنا رقعہ اور حوالہ دے کر روانہ کرتے اور اِس بات کو یقینی بناتے کہ مالی وسائل کی کمی کے باعث کوئی علاج معالجے سے محروم نہ رہ جائے۔ اُن کے دال روٹی والے سادہ سے دسترخوان میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت اور وسعت نصیب فرمائی تھی۔ شاید اسی وجہ سے میں نے ان کے گھر میں غریب اور بھوکے مردوں‘ عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد کو ہمیشہ اور مستقل بنیادوں پر باقاعدگی سے کھانا کھاتے دیکھا تھا اور یہ سلسلہ اُن کی زندگی کے آخری دن تک جاری وساری رہا۔ ساہیوال کے لوگ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں عبدالستار ایدھی کے لقب سے نواز چکے تھے۔

بطورِ مستجابُ الدعوات بزرگ

ملک خورشید احمد صاحب کی شخصیت کا یہ گوشہ اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہا ہوگا‘ کیونکہ اُن کی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے افراد ہی اِن باتوں کو جانتے ہیں۔ میں یہاں صرف اپنے چند مشاہدات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان واقعات کے بیان کرنے کا مقصد کسی کی پیری اور ولایت کی دھاک بٹھانا ہرگز نہیں بلکہ قارئین کو یہ باور کروانا ہے کہ جو لوگ اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ دُکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا شعار بناتے ہیں اُن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جاتے ہیں اور اُن کی دعائیں ان کے اور دوسروں کے حق میں قبول فرماتے ہیں۔ ذیل میں میرے چند ذاتی مشاہدات پیش خدمت ہیں:

ملک خورشید احمد صاحب کی وفات سے چار روز قبل ۱۳ مارچ کو مجھے اُن کا فون آیا اور اُنہوں نے فون نہ کرنے اور حال نہ پوچھنے کا گلہ کیا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ مجھے شدید بخار تھا جس کی وجہ سے میں رابطہ نہ کر سکا۔ اُنہوں نے کہا کہ تم فکر مت کرو‘ میں اللہ سے دعا کروں گا‘ وہ میری دعائیں سنتا اور قبول کرتا ہے۔ ۱۴ مارچ کی صبح جب میں اُٹھا تو میرا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ جب میں دفتر پہنچا تو ملک صاحب کا فون آیا جس کا انداز یہ تھا: مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا بخار اُتر گیا ہوگا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اُن کو بے شمار دعائیں دیں۔

اسی طرح ۱۹۹۵ء میں جون کے مہینے کی ایک گرم دوپہر کو اُنہوں نے ساہیوال جانا تھا۔ آسمان سے آگ اور لو برس رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں بس یا لاری پر نہیں جانا چاہتا۔ وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ یا اللہ! میرے لیے کسی گاڑی کا بندوبست فرما دے‘ میرے مالک! میں ویگن یا لاری پر نہیں جانا چاہتا۔ میں اُن کے قریب بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ باہر گھنٹی بجی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا تو ایک صاحب میرے والد صاحب سے ملنے آئے تھے اور اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ساہیوال سے آیا تھا تو سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کو سلام کرتا جاؤں۔ وہ واپس جانے کے لیے گاڑی کی طرف بڑھے تو اچانک خورشید صاحب باہر آ گئے اور بولے: ’’بیٹا! اللہ نے تمہیں میرے لیے بھیجا تھا‘ مجھے ساتھ لیتے جاؤ!‘‘ یوں ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر ساہیوال چلے گئے۔

ایک اور نا قابل فراموش واقعہ اُس وقت پیش آیا جب اُن کی بڑی بیٹی' جو راولپنڈی میں مقیم تھیں' شدید بیمار ہو گئیں اور جنرل ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔ جسم میں خون کی شدید کمی کے باعث جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ ملک صاحب مستقل دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اُس دن میں نے جس طرح دُعاؤں کی فوری قبولیت ہوتے دیکھی ایسی اپنی زندگی میں آج تک دوبارہ نہیں دیکھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اُنہوں نے جو التجا بھی بارگاہِ ربّ العزت میں پیش کی وہ من وعن وسائل کی فراہمی کی شکل میں پوری ہوتی چلی گئی۔ اللہ کی مدد اور نصرت آن پہنچی اور اُن کی بیٹی بچ گئی۔ مجھ سے کہنے لگے: ''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ اسے کچھ نہیں ہوگا!'' بے شک جو لوگ اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کو بھی اپنا شعار بنا لیتے ہیں وہی اللہ کے ولی ہوتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج ساہیوال (منٹگمری) سے تعلق اور یادداشتیں

۱۹۹۲ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال کے میگزین کے شائع ہونے والے گولڈن جوبلی نمبر میں ملک خورشید احمد صاحب کا خودنوشت مضمون ''میری چند یادداشتیں'' شائع ہوا تھا جس میں آپ نے اپنے قلم سے اپنی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ آج مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس مضمون کے چند اقتباسات بھی قارئین کی نذر کر دیے جائیں۔ اپنی ساہیوال آمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''گیارہ بجے دن کالج پہنچا۔ کالج کی شاندار بلڈنگ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ لائبریری کی پچھلی جانب سائیکل سٹینڈ پر چوکیدار اللہ بخش کے پاس سامان رکھا اور لائبریری میں داخل ہوا۔ وہاں پروفیسر رضاء اللہ خان صاحب اور پروفیسر عبدالمالک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ رضاء اللہ خان صاحب لائبریری انچارج تھے۔ فوراً ملک منصب کی کنٹین سے مینگو سکویش اور کیک پیس منگوائے گئے۔ آج بیالیس سال گزرنے کے باوجود مجھے اس خلوص اور پیار سے پلائے گئے سکویش اور کھلائے گئے کیک پیس کا مزہ یاد ہے۔ میں سفر کی تمام کوفت اور تھکان ان دو اصحاب کے پیار اور خلوص کی وجہ سے قطعی بھول گیا۔ یہاں سکندر علی بھٹی کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ یہ اُس وقت لائبریری کلرک تھے اور باوجود اس حقیقت کے کہ میرے آنے سے ان کو نوکری سے جواب ہو سکتا تھا (اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا) اپنے فطری خلوص' پیار اور محبت کو نہ دبا سکے۔

اتنی دیر میں پروفیسر نذیر احمد بھلی صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ایک جانی پہچانی شخصیت میسر آ گئی۔ بھلی صاحب مجھ سے تین سال سینئر تھے اور پرنس آف ویلز کالج جموں کے ہونہار طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب بھی اسی کالج کے گریجوایٹ تھے۔ بھلی صاحب اور عزیزم سکندر بھٹی نے میری رہائش اور کھانے کا مسئلہ حل کر دیا۔ (یہ دونوں حضرات وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے' آمین!)''

کالج کے پرنسپل میاں اصغر علی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جناب پرنسپل میاں اصغر علی صاحب کے پرنسپل بن کر آنے سے کالج نے بہت ترقی کی اور وہ بلاشبہ ایک سنہری دور تھا۔ کالج تمام شعبوں میں اُس وقت عروج پر تھا۔ لائبریری میں انقلابی اقدام کیے گئے۔ ریڈنگ روم کو بہترین فرنیچر اور ساز و سامان سے مزیّن کیا' حوالہ جاتی کتب اور تمام رسائل کے تازہ شمارے رکھے گئے۔ ریڈنگ روم میں اتنا رش ہو گیا کہ ہم یہ سوچنے لگے کہ کرسیوں کی ایک اور قطار لگا دی جائے۔ شاید یہ واحد ادارہ تھا جہاں کالج لائبریری کے اوقات کار صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کر دیے گئے اور یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔''

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''میں یہاں یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو آغاز میں فیصلہ کیا تھا کہ یہاں سے ٹرانسفر کروا کر کسی بہتر

جگہ چلا جاؤں گا تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس بڑھتا چلا گیا کہ ساہیوال سے بہتر جگہ دنیا کے کسی خطے میں نہیں۔ یقین کریں اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ کالج کا ماحول شروع سے آخر تک ایسا رہا کہ جیسے یہ ہمارا گھر ہے اور ہم سب ایک کنبہ کے افراد ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمارا واقعتاً تعلق ایسا ہے کہ خونی رشتہ بھی کیا ہوگا۔ مجھے اس وقت بہت سے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اگر ان کو لکھنا شروع کروں تو ختم نہ ہوں۔''

آخر میں لکھا ہے:

''میں ۱۹۸۴ء میں کالج سے ریٹائر ہوا۔ ساہیوال میں پبلک لائبریری نہ تھی۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ یہاں پبلک لائبریری قائم ہو۔ چودھری ممتاز حسین، جن سے کالج کی وجہ سے تعلق تھا اُنہوں نے میری خواہش کو پذیرائی بخشی اور بحیثیت وزیر تعلیم و مالیات ایک شاندار لائبریری کے قیام کا حکم نامہ جاری کیا۔''

مذکورہ لائبریری کا نام جناح پبلک لائبریری ہے اور ملک خورشید احمد صاحب ہی اس کے بانی لائبریرین بھی تھے۔ ۱۹۸۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد ایک طویل عرصہ تک ملک صاحب اس لائبریری سے منسلک رہے اور اس ادارے نے اُن کی نگرانی میں خوب ترقی کی۔

ڈاکٹر رفیع الدین اور ڈاکٹر اسرار احمد سے تعلقات اور اقبالیات

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نہ صرف برصغیر بلکہ بین الاقوامی سطح کی ایک انتہائی معروف اور بلند پایہ شخصیت تھے اور رشتے میں ملک خورشید احمد صاحب کے چچا تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈاکٹر رفیع الدین کو اقبال اکیڈمی کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ملک خورشید احمد صاحب نے مجھے ڈاکٹر رفیع الدین، Bertrand Russel اور علامہ اقبال کے بارے میں کئی نادر معلومات فراہم کیں جو کتب میں موجود نہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے بارے میں اُنہوں نے بتایا کہ وہ Bertrand Russel اور ES Brightman جیسے بین الاقوامی اور رادھا کرشنن جیسے مقامی فلاسفروں کے ہم پلّہ فلاسفر اور سکالر تھے۔ خورشید احمد صاحب نے یہ بھی بتایا کہ Bertrand Russel کے آخری عمر کے چند نہایت اہم خطوط، جو اُنہوں نے ڈاکٹر رفیع الدین کے نام لکھے تھے، ان کی شخصیت کے نہاں گوشوں کے بارے میں نہایت نادر معلومات فراہم کرتے ہیں، جن میں Bertrand Russel نے اسلام سے گہری دلچسپی کا بھی اظہار کیا تھا اور یہ خطوط ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے ملک صاحب مرحوم کو دکھائے بھی تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی شخصیت کے حوالے سے ایک مرتبہ مجھے ملک خورشید صاحب کے ہمراہ معروف مذہبی سکالر جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ملک صاحب کو قرآن اکیڈمی مدعو کیا تھا اور میں اُن کے ساتھ تھا۔ چونکہ ملک صاحب ڈاکٹر رفیع الدین کے بھتیجے تھے اِس لیے ڈاکٹر اسرار احمد اس حوالے سے چند معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ راقم الحروف اُس وقت کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں سالِ دوم کا طالب علم تھا اور ہاسٹل میں رہائش پذیر تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اور ملک صاحب کی اقبالیات کے بارے میں جو باتیں اُس دن میں نے سنی اُن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ملک خورشید صاحب اقبالیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

اقبالیات کے حوالے سے میں اُن کے ساتھ ۱۹۹۲ء میں پروفیسر محمد منور مرزا صاحب کی دعوت پر اقبال اکیڈمی گیا اور اُن سے ملاقات کی۔ وہ ملک خورشید احمد صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے بھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے حوالے سے ملک صاحب کی بہت قدر کی۔ اُسی روز میں اقبال اکیڈمی کا رُکن بنا اور یہ رکنیت آج بھی قائم ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ان کا رابطہ ہمیشہ کسی نہ کسی صورت قائم رہا۔ جب بھی لاہور آتے تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ضرور کرتے اور ڈاکٹر صاحب بھی ان کا خوب احترام اور حتی المقدور خاطر تواضع کرتے۔

راقم الحروف سے ذاتی مراسم

رشتے کے اعتبار سے ملک خورشید صاحب یوں تو میرے ماموں تھے' لیکن یہاں میں یہ اعتراف کرنا لازم جانتا ہوں کہ میری شخصیت پر تربیت کے حوالے سے جتنے احسانات ملک صاحب کے ہیں وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ بچپن سے لے کر آج تک میرے اندر اخلاقی' مذہبی اور انسانی حوالے سے اگر کوئی اچھی اور عمدہ بات موجود ہے تو وہ اُنہی کی ذات کے مرہونِ منت ہے۔ ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بہترین دوست' غم گسار' ہمدم اور مستقل رہنما بھی تھے۔ یہاں یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۷۸ء کی ایک رات والدہ کی اچانک اور ناگہانی موت نے میری دس برس کی شخصیت اور زندگی کا رُخ یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ مزاج میں زبردست تغیرات جنم لینے لگے تھے۔ چنانچہ اس حادثے کے بعد ملک صاحب باقاعدگی سے ہمارے گھر آنے لگے اور میری تربیت کا اُنہوں نے خصوصی خیال رکھا۔ والدہ کی وفات پر اُن کے الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں جب اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری ماں میری بڑی پیاری بہن تھی اور تم اس کے بچے ہو اور میرے پاس میری بہن کی نشانی ہو۔ والدہ کی وفات کے بعد اُن کی محبت اور شفقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے مسجد کا راستہ دکھایا' وہی مجھے قرآنِ حکیم کی دعوت سے روشناس کرواتے رہے اور یہ کام میری دس گیارہ برس کی عمر سے شروع ہو کر میرے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے زمانے تک جاری رہا۔ اُنہوں نے میرا اُس وقت تک تعاقب کرنا نہ چھوڑا جب تک میں نے قرآن مجید اور دورۂ حدیث مکمل نہ کر لیا۔ کم سنی میں جن بچوں کے والدین میں سے کسی ایک کی اگر موت واقع ہو جائے تو اُن کی شخصیت عدمِ اعتماد کے باعث ادھوری رہ جاتی ہے' لیکن آفرین ہے ملک خورشید صاحب پر کہ اُن کی رہنمائی اور تربیت سے میں نے نہ صرف اپنے ہم عصروں میں سب سے بہترین تعلیم حاصل کی بلکہ اُن کے ہر ہفتے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں میرے پاس آنے کے باعث کئی تقریری مقابلوں میں حصہ لیا اور میرے کئی مضامین کالج میگزین کی زینت بنے۔ والدہ کی وفات سے لے کر اور بعد ازاں جب خاندانی نظام ایک بری طرح کی ناہمواری' ٹوٹ پھوٹ اور مصنوعی جوڑ توڑ کا شکار ہونے لگا تو ملک صاحب ہی وہ ہستی تھے جنہوں نے میرے اندر جنم لینے والی بغاوتوں کو کچل کر مجھے بعض انتہائی خوفناک انتقامی اقدامات سے بچا لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے' آمین۔ مختصر یہ کہ اگر میں یہ کہوں کہ ملک خورشید صاحب نے میرے روحانی باپ کا کردار ادا کیا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ زندگی کا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ ہی کیوں نہ ہو اُنہوں نے اُس کا بہترین حل سجھایا۔ مسائل آج بھی موجود ہیں اور جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو ملک صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ؎

یادیں ترے خلوص کی ڈستی ہیں آج بھی ملنے کی آرزوئیں ترستی ہیں آج بھی
آنکھیں ہزار صبر کی کوشش کے باوجود رُک رُک کے بار بار برستی ہیں آج بھی

آخری ایّام' وفات اور چند یادیں

ملک خورشید احمد صاحب کی زندگی کے آخری تین برس کمزوری اور گھٹتی بڑھتی بیماری میں گزرے۔ آخری سال میں سفر کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا تھا اور لاہور آنا جانا جو پہلے اُن کا معمول تھا' وہ بھی باقی نہ رہا اور کمزوری نے کوٹ الٰہ دین نمبر۲ ساہیوال تک محدود کر دیا تھا۔ چنانچہ میں ہی اِن برسوں میں تین مرتبہ اُن سے ملنے ساہیوال گیا۔ اِس تمام بیماری اور تکلیف کے باوجود خلق خدا کی خدمت' بھوکوں اور ناداروں کی مدد' غرباء اور مساکین کی خبر گیری اُسی طرح جاری و ساری رہی۔ اکثر کسی نہ کسی غریب مریض کے لیے مجھے فون کرتے تھے اور علاج معالجے کے لیے ہر ممکن تعاون کی ہدایات جاری

کیا کرتے تھے۔ یہی غرباء، مساکین اور محتاجوں کی دادرسی اُن کی زندگی کے آخری دن تک جاری وساری رہی۔ ۱۶ مارچ ۲۰۱۴ء کی شام کو گرنے کے باعث سر پر چوٹ لگی۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات سے جب کچھ بہتری پیدا ہوئی تو رات دس بجے کے بعد سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ اِس کے بعد نیند آ گئی اور سو گئے اور ۱۷ مارچ ۲۰۱۴ء کو نصف شب بغیر کسی کو تکلیف میں مبتلا کیے نہ جانے کس وقت حالت نیند ہی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اُن کے چہرے پر موت کی اذیت کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ ایک ایسا سکون تھا جو بہت کم خوش نصیبوں کو نصیب ہوا کرتا ہے۔

آج ۱۷ مارچ کو جب اُن کی میت ان کے گھر میں رکھی ہوئی تھی تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کی وہ حاجت مند اور غریب افراد جن کو آج کا ٹائم دیا ہوا تھا وہ ملک صاحب کے دروازے پر کھڑے تھے، لیکن اُنہیں کیا خبر تھی کہ آج اُنہیں نامراد ہی لوٹنا پڑے گا، کیونکہ اُن کا مسیحا، غم گسار اور دُکھوں کا بانٹنے والا ابدی نیند سو گیا تھا۔ یوں تو ملک خورشید صاحب کے جنازے میں ڈاکٹرز، انجینئرز، وکلاء اور پروفیسرز سب موجود تھے، لیکن قابل غور بات یہ تھی کہ غریب بچے، عورتیں اور بوڑھے افراد کی ایک کثیر تعداد بھی اشک بار آنکھوں کے ساتھ جنازے کے ساتھ موجود تھی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے ملک خورشید صاحب کی وہ بات یاد آ گئی جو وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اگر میرے جنازے پر کوئی بھی نہ آیا اور کوٹ الٰہ دین کے یہ غریب لوگ مجھے اُٹھا کر قبرستان لے گئے اور دعاؤں کے ساتھ دفنا دیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ زندگی کامیابی اور کامرانی سے گزر گئی اور آخرت بھی سنور گئی۔

آج ملک خورشید صاحب کو کوٹ الٰہ دین نمبر ۲ ساہیوال کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا اور میں تدفین سے فارغ ہو کر لاہور واپس آ رہا تھا اور جیسا کہ مضمون کے آغاز میں ذکر کر چکا ہوں، آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں ملک صاحب کو تلاش کرتا ہوا تھک ہار کر آنکھیں بند کر کے گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک گاڑی کے رُکنے سے آنکھ کھل گئی اور والد صاحب نے بتایا کہ گھر آ گیا ہے۔ میں نے آسمان میں گھور کر جب ملک خورشید صاحب کو پکارا تو بار بار ایک ہی آواز سنائی دے رہی تھی جو کہیں دُور سے آ رہی تھی ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم!

آخر میں اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ وہ ملک خورشید صاحب کی مغفرت فرمائے اور بر بنائے تقاضائے بشری اُن سے جو خطائیں ہوئیں وہ اپنی رحمت سے معاف فرما دے اور اُن کے اعمالِ صالحہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما لے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دُعا ہے کہ وہ ملک صاحب کی قبر کو نور سے منور فرما دے، جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے اور اُنہیں قبر اور آگ کے عذاب سے محفوظ فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین، ثم آمین، یاربّ العالمین!

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

نوٹ: زیرِ نظر مضمون میں تمام نجی اور ذاتی نوعیت کی معلومات ملک خورشید احمد صاحب کی صاحبزادی محترمہ پروفیسر حمیرا خورشید صاحبہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ دیگر تمام معلومات اور حوالہ جات کے لیے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ادارے قرآن اکیڈمی لاہور اور اقبال اکیڈمی لاہور کا مفید معلومات مہیا کرنے پر شکر گزار ہوں۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ۱۹۹۲ء کے گولڈن جوبلی نمبر شمارے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : روح الامین کی معیت میں کاروانِ نبوت (حصہ دوم)

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر تسنیم احمد

ضخامت:256 صفحات قیمت: [برائے اشاعت مزید] 250 روپے

ملنے کے پتے : (۱) کتاب سرائے' اردو بازار' لاہور (۲) فضلی سنز' اردو بازار کراچی

زمانی ترتیب کے ساتھ سیرت النبی ﷺ کے واقعات قلمبند کرنے کی یہ قابل قدر کوشش ہے۔ مصنف کا ارادہ ہے کہ اس طرح کتاب اندازاً دس حصوں پر مشتمل ہوگی۔ کتاب کا پہلا حصہ طبع ہو چکا ہے' جو قبل بعثت سے نبوت کے تیسرے سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ نبوت کے چوتھے سال اور پانچویں سال کے نصف اول کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر تسنیم کو اللہ تعالیٰ نے تحقیقی ذہن، فکر رسا اور محبت رسول ﷺ کے جذبات سے نوازا ہے۔ جب یہ کتاب مکمل ہو جائے گی تو یہ ایک ریفرنس بک ہوگی جس میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے واقعات شروع سے آخر تک اس انداز میں ملیں گے کہ قرآن کی کون سی آیات کس سال میں کن حالات میں نازل ہوئیں۔ اس سے قرآن مجید کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

کتاب کا پہلا حصہ آٹھ ابواب پر مشتمل تھا۔ یہ دوسرا حصہ نویں باب سے شروع ہوتا ہے اور اکتیسوں باب پر ختم ہوتا ہے۔ کتاب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ چوتھے اور پانچویں سال رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے نام ترتیب زمانی کے ساتھ بتائے گئے ہیں کہ کون کن حالات میں اور کس سال مشرف بہ اسلام ہوا۔ نیز قرآنی آیات تنزیل میں کون سی پہلے اور کون سی بعد میں ہیں۔ سیرت کے واقعات پوری صحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں' جن سے رسالت مآب ﷺ کے ساتھ مصنف کی عقیدت اور محبت عیاں ہے۔ نبوت کے چوتھے اور پانچویں سال کے دوران آپ ﷺ پر ایمان لانے والے جاں نثاران کا ذکر ہے اور اُن پر کفار مکہ کے ظلم وستم اور شدائد کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے صفحات میں اہم ترین پیراگراف کو Shade کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔

کتاب بڑی معلومات افزاء اور حب رسول ﷺ کی آئینہ دار ہے۔ کتاب کے آخر میں دس صفحات پر مشتمل تفصیلی اشاریہ دیا گیا ہے۔ کتابیات کی فہرست میں سولہ کتب کے نام دیے گئے ہیں جن میں ہر ایک کی عظمت مسلم ہے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-Ma'idah

(The Repast / The table laden with food)

(Recap of verses 35 – 50 of Surah Al-Ma'idah and fresh exposition of verses 51 – 66 of the same Surah , inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recapof verses 35– 50 of Surah 5, Al-Ma'idah

The reader would recall that we had concluded our exposition of verses 35 – 50 of Surah Al-Ma'idah in the previous issue of Hikmat e Qur'an. A brief recap of the exposition follows:

1- In verse 35, Allah *(SWT)* commands His servants to obey Him sincerely and avoid everything which is against His Will or law and solicit all means which might bring them close to Him.

2- While verse 36 unveils the actual reality of this world and its 'treasures', which amount to nothing as compared to the blessings of the Hereafter, the following verse further clarifies that the unbelievers will never be able to escape the torment of Hellfire and they will be forced to abide in it eternally.

3- Verse 38 details the punishment ordained by Allah *(SWT)* for anyone proven guilty of theft and lays down one of the major priorities in a genuine Islamic Welfare State, viz., protecting the wealth and honour of its citizens as well as serving justice to the perpetrators of crime.

4- Verses 39 and 40 explain that forgiveness granted by Allah *(SWT)* means repenting and becoming righteous by purging one's soul of the sin of stealing (theft). However, in the case that even after the hand of a thief has been cut off, he does not purge himself of the evil intent of stealing and continues nurturing this impure feeling, it would signify that 'stealing' still remains engrained in his soul. Consequently, he would continue to merit Allah's *(SWT)* wrath in the same way as he used to before his hand was cut off.

5- Verse 41 provides instruction to the Prophet *(SAAW)* and Muslims in general on how to deal with people who devote all their capacities and efforts to ensure that the status quo ante of *"jahiliyah"* remains intact, and that the reformative mission of Islam should fail to set right the corruption that had come down to them from the past. The verse also enunciates the underlying reasons of such behaviour shown by these people as well as the various methods used by them to undermine the work of bringing glory to Islam.

6- Verse 42 is believed to have been revealed at a time when the Jews had not yet become full-fledged subjects of the Islamic State of Madinah. The verse, by using a real-life incident, makes a pointed reference to the judges and the jury-consults who accept false evidence and invent reports in order to issue verdicts contrary to justice and in favour of either those who bribe them or with whom their illegitimate interests lie.

7- Verse 43 further unmasks the dishonesty and absence of sincerity among the Jewish people (particularly the rabbis) when it comes to making decisions based on divine scriptures. Their true religion consists merely of worshipping their interests and desires which makes them willing to obtain judgements in their favour by hook or by crook.

8- Verse 44 educates the Jews by telling them that all the Prophets *(AS)* were Muslims (submitters to Allah *(SWT)*) whereas the Jews had deviated from Islam (submission to Allah *(SWT)*), and true to their chauvinistic sectarianism and blatant racism, were content with remaining merely 'Jews' as a nation rather than the followers of a religion. Allah *(SWT)* commands the Israelites to fear Him *(SWT)* alone and not to distort or conceal what He *(SWT)* had revealed to them (in the Torah and later) in fear of other men or to suit their own desires. Moreover, the verse is as applicable to Christians and Muslims as it is to Jews.

9- Verse 45 indicates that Allah *(SWT)* had ordained the law of retribution in the Torah, almost similar to as it is in Islam, but the Jews defied the ruling and refused to accept the divine commandments. However, Allah *(SWT)* has also given the option to the one harmed to relinquish his right of retaliation and says that if he does so, it is a very noble deed which will atone for many of his sins.

10- In the continuous chain of the Prophets sent to the Children of Israel, Jesus *(AS)* the son of Mary *(AS)*, was the last one. Verse 46 explains that the Messiah *(AS)* did not expound a new religion. That very religion which had been the religion of all the Prophets *(AS)* was also his religion, and it is towards that religion that he called people.

11- Verse 47 starts by warning the Christians to judge according to what Allah *(SWT)* has revealed to them, and believe in all that is present therein including the coming of the Allah's Last Messenger *(SAAW)* with His Last and final revelation i.e. the Qur'an. Moreover, the verse submits a three-in-one decree against those (not limited to Christians only) who do not judge in accordance with the Law revealed by Allah *(SWT)*. The first is that they are "kafir" (unbelievers); the second, that they are "zalim" (wrong-doers/oppressors); and the third, that they are "fasiq" (transgressors). This clearly means that one who, in disregard of Allah's *(SWT)* commandments and of the Laws revealed by Him, pronounces judgements according to man-made laws (whether made by himself or by others) is guilty of three major offences (which may vary in intensity).

12- Verse 48 points to a fact of major significance - The Qur'an and all those Books sent down by Allah *(SWT)* at various times and in different languages in reality constitute one and the same Book. Their Author *(SWT)* is one and the same; their aim and purpose are the same; their teaching is the same; and the knowledge which they seek to impart to mankind is the same. The difference between these Books lies in their modes of expression, and this was necessarily so since they were addressed to different audiences. It is, therefore, not merely that these divine books support rather than contradict each other but that they are actually different editions of one and the same book - 'The Book'.

13- Verse 49 resumes the subject found in the previous verse and details the method of doing Justice among people repeated at the start of this verse for emphasis of the command. This verse also tells the Prophet *(SAAW)* to beware of the Jews who were always in search of an opportunity to deceive him and wished to turn him *(SAAW)* away from the truth. The audience of this verse are Muslims in general too, as the next part of the verse warns that if ordinary Muslims disbelieve, it is Allah's *(SWT)* Will to deviate them from the truth and scourge them for some of their sins.

14- Verse 50 states that Allah *(SWT)* is the Creator of mankind and He *(SWT)* has the perfect knowledge of everything. Therefore those

who are enlightened by His *(SWT)* blessing with "ilm" (true knowledge) as opposed to "jahiliyah" (ignorance) know as a certainty that Allah *(SWT)* knows best what is beneficial for humans and what is harmful to them.

==========

Expositionof verses51 to 66 of Surah Al-Ma'idah

Verse 51

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

"Believers! Do not take the Jews and the Christians for your allies. They are the allies of each other. And among you he who takes them for allies, shall be regarded as one of them. Allah does not guide the wrong-doers."

In this verse of pivotal importance in defining the foreign policy of an Islamic state, Allah *(SWT)* prohibits the Muslims to take the Jews and the Christians as their friends, long-term allies and protectors. Because they are only friends and protectors to one another against Islam and have a strong enmity against the Muslims, hence the stern warning to Muslims who join them or act as their agents.

This verse is more applicable in present times because we see that throughout the long Judeo-Christian history the relationship between the Jews and the Christians has not been good and it is quite understandable as the latter not only hold the former responsible for the crucifixion of Jesus *(AS)* but also resent their slander that Jesus *(AS)* was born out of wedlock. Today, however, all this has changed. The Jews have gradually eroded the Christian society dividing them into different factions, most of which support them. Protestant Christians, in general, and among them Evangelical Christians, in particular, provide massive financial and political support to the Jews to the extent that these Christian conservatives are sometimes often referred to as Christian Zionists for their blatant bias.

Verse 52

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

"Indeed you see those afflicted with the disease of hypocrisy race towards them, saying: 'We fear lest some misfortune overtakes us. And it may happen that Allah will either bring you a decisive victory or bring about something else from Himselfand then they will feel remorseful at their hypocrisy which they have kept concealed in their breasts"

The outcome of the conflict in Arabia between Islam and unbelief *(kufr)* had not crystallized. Although Islam had become a formidable force owing to the daring, courage and sacrifices of its followers, the forces opposed to it were also tremendously powerful. To an objective observer it might have seemed that either party had an equal chance of success, and so certain people (appearing to be hypocrites at that time) sought to maintain good relations with the Jews and the Christians despite being a part of the Muslim body politic. They expected refuge and protection from the Jews in case Islam was defeated. Moreover, the Jews and Christians held the greatest economic power in Arabia insofar as the economic system and the greenest and most fertile regions of Arabia were in their possession. For these reasons (and only Allah knows Best) such people were keen to maintain good relations with them: they thought that, to regard the conflict between Islam and unbelief as crucially important, and to sever their relations with all those currently in conflict with Islam, would be too great a risk both politically and economically.

However, the matter regarding genuine and 'certified' hypocrites was different in contrast to the ones mentioned above. Their intentions were to cause hurt and damage to Islam at all cost. For instance, the chief leader of the hypocrites, Abdullah bin Obaee, remained an enemy of Islam and a back-stabber for Muslims till death, which occurred at a time when the balance of power had started to tilt considerably towards Islam as the dominant force in the region.

This verse covers both "sceptical" people (ones following a policy of wait and see) as well as "genuine" hypocrites (following a policy to damage Islam at any cost) and unveils the respective positions that were concealed in their hearts.

Verse 53

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ﴿٥٣﴾

"And (while) those who believe will exclaim: 'Are these the self same people who solemnly swore by Allah that they were with you!' All their acts have gone to waste and now they are the losers."

The verse declares that no matter how much the genuine hypocrites (mentioned in the previous verse) profess to follow Islam – by performing Prayers, by observing Fasts, by paying Zakah, by taking part in wars – all was reduced to naught because they had not devoted themselves to the service of the One True Allah *(SWT)*. In pursuit of their worldly ambitions they had split their souls into two, distributing half to Allah and half to those in rebellion against Him *(SWT)*.

Verse 54

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾

"Believers! If any of you should ever turn away from your faith, remember that Allah will raise up a people whom He loves, and who love Him; a people humble towards the believers, and firm towards the unbelievers; who will strive hard in the way of Allah and will not fear the reproach of the admonisher. This is the favour of Allah which He grants to whom He wills. Allah is vast in resources, All-Knowing."

The phrase 'humble towards believers' signifies that a person should never use his strength against the believers. His native intelligence, shrewdness, ability, influence, wealth, physical prowess should not be used for the purpose of either suppressing, persecuting or causing harm to the Muslims. Among themselves, the Muslims should always find him gentle, merciful, sympathetic and mild tempered.

The phrase 'firm towards unbelievers', on the contrary, means that by virtue of the intensity of his faith, the sincerity of his conviction, his strict adherence to his principles, his strength of character and his insight and perspicacity born of faith, a man should be firm as a rock in his dealings with the opponents of Islam, so that they find it impossible to dislodge him. There should be no doubt in their minds that the believer would rather lay down his life than compromise his position by yielding to external pressures.

In following the religion of Allah *(SWT)*, in implementing His *(SWT)* injunctions, in judging things to be either right or wrong according to the criteria of the faith, the believer will be afraid of nothing. He will be impervious to opposition, reproach, denunciation, name-calling and scorn. Even when public opinion happens to be hostile, and his efforts to follow Islam single him out for the scorn of the whole world, the man of faith will still follow the way which he recognizes in his heart to be true.

Verse 55

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ﴿٥٥﴾

"Only Allah, H is Messenger, and those who believe and who establish Prayer, pay Zakah, and bow (before Allah) are your allies."

Verse 56

وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٥٦﴾

"All those who take Allah and His Messenger and those who believe as their allies,(should remember that) the party of Allah will be triumphant."

Verses 55 and 56 have a common underlying theme and are understood better when read together.

The hypocrites take their friends from the disbelievers or others from the Jews and the Christians instead of the believers but the real protecting friends are Allah *(SWT)*, His Messenger *(SAAW)* and the faithful believers who perform their regular prayers, give the poor their due and bow down in humility when they give charity. Alternatively it also means that they bow down in obligatory prayers in congregation with other believers.

It logically follows that these are the people who will gain success in this world and, more importantly, in the Hereafter.

Verse 56 also directs the attention of the believers that they must be patient in their desire for victory. They ought to "have faith in the process" because Allah *(SWT),* in His *(SWT)* Infinite Wisdom, puts people through trials and tests their faith in various ways. The verse ends with the glad tiding for the believers that sooner or later, Allah's *(SWT)* followers are sure to triumph.

Verse 57

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٥٧

"Believers! Do not take for yourallies those who make a mockery and sport of your faith, be they those given the Book before you or other unbelievers. Fear Allah if you indeed believe."

Verse 58

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝٥٨

"And when you call for Prayer, they take it for amockery and sport. That is because they are a people who do not understand.

Verses 57 and 58 have a common underlying theme, with the former being more general in implication than the later, and are understood better when read together.

Verse 57 ordains Muslims to refrain from considering such unbelievers and People of the Book (Jews and Christians) as allies who try to make fun of Islam in any form or manner. This verse is as relevant for the Muslims of today as it was for those living 14 centuries ago.

Verse 58 has a message similar to the one given in verse 57, albeit more specific to an Islamic ritual – "The Call to Prayer" *(Adhan).* During the early days of Islam, whenever the unbelievers (and in certain cases the Jews and Christians) heard "The Call to Prayer" (*Adhan*) they made fun of it by mimicry, perverted its words to ridicule it, and gave utterly disparaging and taunting remarks about it. The verse declares that

these were merely acts of absurdity on the part of unbelievers. Had they not been ignorant and foolish, they would not have stooped to such vain tactics, despite their significant differences with the Muslims on religious questions. After all, can any reasonable person be happy to see the people who call to the worship of Allah *(SWT)* be ridiculed and mocked?

Verse 59

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝٥٩

"Say to them: 'People of the Book! Do you hate us for anything else except that we believe in Allah, and in the teaching which has been revealed to us and in the teaching which was revealed before? Indeed most of you are transgressors.'"

In this verse,Allah *(SWT)* commands His Messenger *(SAAW)* to ask, rather take to task, those who make fun of Islam and its followers by ridiculing the Islamic teachings and mock Muslims just because they believe in One True Allah *(SWT)*.

In the verse, Allah *(SWT)* also commands His Messenger *(SAAW)* to rebuke them for their despicable attitude towards the Holy Qur'an and all the divine scriptures revealed before it.

The verse then declares the fact that most of them are rebellious in nature and evil-doers.

Verse 60

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ ۝٦٠

"Then say to them: 'Shall I tell you about those whose retribution with Allah is even worse? They are the ones whom Allah has cursed, and who incurred His wrath and some of whom were changed into apes and swine, and who served the false deities. Such have an even worse rank and have strayed farther away from the right path."

The allegory used in this verse alludes to the Jews whose history shows that they were subjected, over and over again, to the wrath and scourge

of Allah *(SWT)*. When they desecrated the law of the Sabbath (found in the Torah) the faces of many of them were distorted, and subsequently their degeneration reached such a low point that they took to worshipping Satan quite openly. The purpose of saying all this is to draw attention to their criminal boldness while they had sunk to the lowest level of evil, transgression and moral decadence, they vigorously opposed all those who, thanks to their faith, lived a truly pious and righteous life.

Verse 61

وَإِذَا جَآءُوكُمْ قَالُوٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾

"Whenever they come to you they say: 'We believe,' whereas, in fact, they come disbelieving, and go away disbelieving, and Allah knows all that they hide."

The verse explains that the hypocrites proclaim their faith and pretend to be Muslims when they are in Prophet's *(SAAW)* presence or with the Muslims. But Allah *(SWT)* informs His Prophet *(SAAW)* about the disbelief and hypocrisy that the hypocrites conceal in their hearts, so much so, that He *(SWT)* dismisses them by stating that they came with disbelief and they went out in the same condition (a zero sum). He *(SWT)* knows their exact intentions and whatever they want to conceal in their hearts.

Verse 62

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾

"You will see many of them hastening towards sin and transgression and devouring unlawful earnings. Indeed what they do is evil."

The verse is fairly self-explanatory as the examples refers to the Jews and we have already read details of the crimes and sins committed by the Jews in depth at other places in the Qur'an. Allah *(SWT)* does not mince words and clearly decrees that their actions are plain and simple 'Evil'.

Verse 63

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾

"Why is it that their scholars and jurists do not forbid them from sinful utterances and devouring unlawful earnings? Indeed they have been contriving evil."

This verse brings to the fore one of the main reasons behind the degeneration of societies and states, stating that such events occur when the scholars and those in authority of furnishing as well as executing justice do not enjoin good or forbid people from committing sinful things. Although the verse uses the case of Jews to explain the phenomenon, it is equally applicable to Christians and Muslims. As for the Jews, their rabbis and jurist quit forbidding the ordinary people from committing sins or consuming illegal things and the ordinary people, with the active support of the Rabbis, persisted in their evil. Consequently, that became the reason for their decline and punishment.

Verse 64

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۭ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾

"The Jews say: 'The Hand of Allah is fettered.' It is their own hands which are fettered, and they stand cursed for the evil they have uttered. No! His Hands are outspread; He spends as He wills. Surely the message that has been revealed to you from your Lord has increased many of them in their insurgence and unbelief, and so We have cast enmity and spite among them until the Day of Resurrection. And as often as they kindle the fire of war, Allah extinguishes it; and they go about trying to spread mischief on earth, whereas Allah does not love those who spread mischief."

To say that someone's hands are tied, in Arabic usage, is to say that he is niggardly, that something prevents him from being generous and bountiful. Thus the Jewish observation does not mean that Allah's *(SWT)* Hand is literally tied but that He *(SWT)* is niggardly and miserly *(Translator's Note: We seek Allah's refuge from such utterances)*. For

centuries the Jews had lived in humiliation and misery. Their past greatness had become legend, seemingly too remote ever to be restored, and so they would blasphemously lament that Allah *(SWT)* had become a miser and that as the door to His *(SWT)* treasury was now permanently locked, that He *(SWT)* had nothing to offer them except suffering and calamity. This attitude, however, is not confined to the Jews. When confronted with trials and tribulations foolish people of other nations, too, are prone to utter such blasphemies rather than turn to Allah *(SWT)* with humble prayer and supplication.

They accused Allah *(SWT)* of the miserliness from which they themselves had suffered and had become notorious for.

If they entertained the hope that by such insolent and taunting expressions they might evoke Allah's *(SWT)* munificence, and that His *(SWT)* bounties would begin to shower upon them, they were dreaming of the impossible. Indeed, such insolence was bound to have the opposite effect - to alienate them further from Allah's *(SWT)* bounty, to cast them even further from His *(SWT)* mercy.

Instead of learning any lessons from the Book of Allah, instead of recognizing their own mistakes and wrongs and then trying to make amends for them, instead of probing their miserable situation and then turning to reform, they reacted by launching a violent campaign of opposition to truth and righteousness. Rather than taking to the right way as a result of being reminded of the forgotten lesson of righteousness, they attempted to suppress the voice which sought to remind them and others of such things.

Verse 65

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾

"Had the People of the Book only believed and been Allah-fearing, We should surely have effaced from them their evil deeds, and caused them to enter Gardens of Bliss."

The verse presents an alternative scenario. Had the Jews sincerely believed in Allah *(SWT)* and followed His Messengers *(AS)*, including the Final Messenger *(SAAW)*, then surely He *(SWT)* would have forgiven their sins and admitted them in Paradise. The handful of Jews

who did choose to follow this alternative path, in fact, did receive glad tiding of Paradise in the Hereafter.

Verse 66

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾

"Had the People of the Book observed the Torah and the Gospel, and all that had been revealed to them from their Lord, sustenance would have been showered over them from abovand risen from beneath their feet. Some among them certainly keep to the right path; but many of them do things which are evil.

The verse establishes that if the People of the Book had established the laws revealed to their Prophets *(AS)* and believed in what was revealed to Prophet Muhammad *(SAAW)* i.e. the Qur'an, then surely Allah *(SWT)* would have blessed them with provisions descending from the sky as well as from those grown in the earth. However, a vast majority of them did nothing but evil.

The subject also appears in the Old Testament (Leviticus: chapter 26 and Deuteronomy: chapter 28) which records a sermon of the Prophet Moses *(AS)* to the Israelites in which he impresses upon them in great detail the bounties and blessings of Allah *(SWT)* with which they would be endowed if they obeyed His *(SWT)* commandments, and the afflictions, scourges and devastations that would descend upon them if they disobeyed Him *(SWT)* and rejected the Book of Allah. That sermon of Moses *(AS)* is an extremely detailed explanation of this verse of the Qur'an.

One example of such People of the Book who adhered to their Books, followed their laws and when Allah *(SWT)* sent His last Prophet *(SAAW)* with His last revelation, they also believed in him and followed him, is that of the famous companion, Abdullah bin Salaam *(RA)*. Abdullah bin Salaam *(RA)*, who was a very knowledgeable and pious Jewish scholar embraced Islam as soon as he heard of Prophet Muhammad's *(SAAW)* message, i.e., the Glorious Qur'an.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

Quarterly
Oct.-Dec. 2017

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol. 36 No.4

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ